# خوف کی قید





اشتیاق احمد

# معاملہ کیا ہے؟

"میں اسے بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں — یہ اس حد تک اداس ہے کہ کیا بتاؤں — یوں لگتا ہے، جیسے اس پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں — میرا جی چاہتا ہے، اُڑ کر اس کے پاس جاؤں — اور آناً فاناً اس کا غم دُور کر دوں" فاروق جلدی جلدی کہہ گیا۔

"لیکن چند قدم کے فاصلے پر بیٹھے ہوئے شخص کے پاس اُڑ کر جانے کی کیا ضرورت ہے — جتنی دیر اُڑ کر جانے میں لگے گی، اتنی ہی دیر قریباً چل کر جانے میں لگے گی — یوں بھی یہ نیشنل پارک ہے، کوئی ایرپورٹ نہیں، جہاں سے تم اڑ کر جا سکو" محمود نے منہ بنایا۔

"تم تو بال کی کھال اتارتے ہو — بائیں بے چاری بھی کیا سوچتی ہوں گی تمہارے بارے میں"

"اس کی ہمدردی سے باتوں کی ہمدردی پر اُتر آئے،

یار تم تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہو۔"

"دیکھو! مجھے گرگٹ نہ کہنا۔ ہاں!" فاروق نے جھلا کر کہا۔

"اچھا چلو — نہیں کہتا میں تمہیں گرگٹ — ویسے سچ بات یہی ہے کہ یہ حضرت حد درجے اداس ہیں — اور مجھے بھی ان پر ترس آ رہا ہے۔"

"تو آؤ — دونوں اس کے پاس چلیں۔"

"لیکن ابھی ہم نے سکول کا کام مکمل نہیں کیا۔"

"تو کیا ہوا — سکول کا کام اس سے ملاقات کرنے کے بعد کر لیں گے — ابھی کافی وقت ہے ہمارے پاس۔"

"اچھی بات ہے۔"

دونوں نے بستے وہیں گھاس پر چھوڑے اور اس کی طرف بڑھے — وہ بھی بنچ کو چھوڑ کر گھاس پر بیٹھا تھا:

"ہم یہاں — آپ کے پاس بیٹھ سکتے ہیں؟"

"ضرور کیوں نہیں۔" وہ اداس انداز میں مسکرا دیا۔

"شکریہ!" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور اس کے بالکل نزدیک بیٹھ گئے:

"آپ بہت زیادہ اداس ہیں؟"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے — اداس تو میں ہوں۔" اس نے کہا —



انھوں نے دیکھا — اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے — آنکھوں میں گویا زندگی کی چمک تھی ہی نہیں، جسم کا گوشت ڈھل چکا تھا — اور ہڈیاں نکلی نظر آ رہی تھیں — جسم پر لباس بھی بہت سستا سا تھا — لیکن وہ صاف ستھرا تھا — یوں وہ لمبے چوڑے قد کا آدمی تھا اور کبھی بہت شان دار صحت کا مالک رہا ہو گا —

"آپ کی یہ حالت کس نے بنائی — کون ہے وہ ظالم؟"

"جی — کیا مطلب؟" وہ زور سے چونکا۔

"میرا مطلب ہے — آپ کس کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں؟" فاروق بولا۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ مجھ پر کسی نے ظلم کیا ہے؟" اس نے گھبرا کر کہا۔

"آپ کی آنکھوں نے۔"

"اوہ! مطلب یہ کہ آپ نے اندازہ لگایا ہے۔" وہ پھر اداس انداز میں مسکرایا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔"

"مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا — بس حالات کا شکار ہو گیا ہوں۔"

"کیا آپ کا کاروبار تباہ ہو گیا ہے؟"

"یہی کر لیں۔" اس نے کہا۔

"گویا بات کچھ اور ہے — کیا کسی نے آپ کا کاروبار ہڑپ کر لیا ہے؟"

"یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔"

"تو پھر کیا کہہ سکتے ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے — میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔" اس نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں — آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے — کوئی بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں — ہم ان شاء اللہ آپ کے لیے اتنا کچھ کر سکتے ہیں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" محمود نے جلدی جلدی کہا۔

"نہیں — کوئی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور یہ میں کسی کو کچھ بتا بھی تو نہیں سکتا، میری زبان پر تو ویسے بھی تالے لگا دیے گئے ہیں۔"

"ہمارے پاس ماسٹر کی ہوتی ہے — ہم ان تالوں کو کھول سکتے ہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔



"کیا مطلب — یہ کیا کہا آپ نے؟"

"فاروق! ایک منٹ ٹھہرو۔" محمود نے اسے گھورا، پھر اس سے بولا:

"نہیں بتانے میں کوئی خطرہ نہیں ہے — آپ بے فکر ہو کر ہمیں بتا سکتے ہیں۔"

"نن — نہیں — نہیں۔" اس نے خوف زدہ ہو کر کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا — پھر تیز تیز قدم اٹھاتا پارک سے باہر جانے لگا۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔"

"آؤ چلیں۔" محمود فوراً بولا۔

دونوں نے جلدی جلدی بستے سمیٹے اور اس کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے — وہ پیدل سڑک کے کنارے جا رہا تھا — انھوں نے بھی مناسب فاصلہ رکھ کر چلنا شروع کیا — اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا، وہ چلتے رہے — یہاں تک کہ آدھ گھنٹے بعد وہ ایک ٹوٹے پھوٹے گھر میں داخل ہو گیا — ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — محمود نے آگے بڑھ کر دستک دی، وہی دروازے پر آیا اور انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا:

"آپ — آپ یہاں بھی آ گئے۔"

ہاں ! جب تک آپ ہمیں اپنی کہانی نہیں سنائیں گے،
اس وقت تک ہم آپ کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

"ہاں ۔ لیکن ۔۔ میں آپ کو اپنی کہانی نہیں سنا سکتا ۔
اس طرح میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"کیا ۔۔ جان خطرے میں پڑ جائے گی ۔۔ اس کا مطلب
ہے ۔ کسی نے آپ کو دھمکی دی ہے کہ کسی کو کچھ نہ بتائیں،
ورنہ وہ آپ کو جان سے مار دے گا۔"

"دے گا نہیں ۔۔ دیں گے ۔۔ وہ ایک دو نہیں ۔ بہت
سے لوگ ہیں۔"

"اور وہ آپ کے دشمن کیوں ہیں؟"

"میری ان سے کوئی دشمنی نہیں ہے ۔۔ بلکہ انھوں
نے تو میری مدد کی ہے ۔۔ لیکن اس مدد کے بدلے
میں وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے بارے میں کسی
کو کچھ نہ بتاؤں ۔۔ ورنہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی ۔۔ جو لوگ مدد کرتے
ہیں، وہ جان سے مارنے کی دھمکی نہیں دیا کرتے۔"

"اب میں آپ کو کس طرح بتاؤں ۔" اس نے اُلجھن کے
عالم میں کہا۔

"اچھا نہ بتائیں ۔۔ یہ کچھ پیسے رکھ لیں ۔ آپ کے



کام آئیں گے۔"

یہ کہہ کر دونوں نے اپنی جیبوں میں جو کچھ تھا،
نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا:

"نن ۔ نہیں ۔۔ نہیں ۔۔ میں یہ نہیں کر سکتا ۔ میں
نے زندگی میں کبھی بھیک نہیں لی ۔ نہ لوں گا ۔ میں کسی
نہ کسی طرح گزر بسر کر ہی رہا ہوں۔"

"کیا آپ کا کوئی بڑا کاروبار تھا کبھی؟" محمود نے
سوچے سمجھے بغیر کہا۔

وہ زور سے اُچھلا:

"آپ نے یہ اندازہ کس طرح لگا لیا؟"

"وہ دراصل ہم اندازے لگانے کے بہت وہ ہیں۔"
فاروق نے شرما کر کہا۔

"وہ کیا؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بس آپ خود ہی سمجھ جائیں ۔۔ ہمیں اپنے منہ
سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔" فاروق نے معصومانہ انداز
میں کہا۔

وہ ہنس پڑا اور یہ ہنسی اس کے چہرے پر نہ جانے
کیسے آ گئی تھی ۔۔ خود وہ بھی حیران رہ گیا:

"ہائیں ۔۔ میں ہنسا ہوں ۔ کمال ہے ۔ میرے چہرے

پر تو مسکراہٹ تک نہیں آتی۔"

"اگر آپ ہمیں اپنی کہانی بتا دیں نا — تو ہم آپ کو خوب ہنسنے کے قابل بنا دیں گے ان شاء اللہ۔ آپ کی اداسی پر لگا کر اڑ جائے گی اور لوٹ کر کبھی نہ آئے گی۔"

"کیسے اڑ جائے گی — پر لگا کر — لیکن اداسی پر لگا کر کس طرح اڑ سکتی ہے۔" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"محاورات کے ذریعے — آپ نہیں جانتے — محاورے بہت بڑے بڑے کام کر ڈالتے ہیں۔"

"نہ جانے کیا بات ہے — آپ سے باتیں کرکے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔"

"اور اگر آپ اپنی کہانی سنا دیں تو یہ بالکل ہی غائب ہو جائے گا۔"

"میں ڈرتا ہوں نا — اس لیے نہیں سنا سکتا — ویسے جی بہت چاہ رہا ہے — سنانے کو۔"

"تو پھر سنا دیں — آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکے گا — آپ ہمیں نہیں جانتے۔"

"کیا مطلب — آپ کون ہیں؟" اس نے چونک کر کہا۔

"ہم — محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں — انسپکٹر جمشید کے



بچے۔" محمود نے کہا۔

"کیا!!!" اس نے چلا کر کہا۔

"کیوں — کیا بات ہے؟"

"اب تو ہرگز نہیں سناؤں گا۔" اس نے گھبرا کر کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"اس طرح تو بات بہت آگے بڑھے گی اور میری مصیبت آئے گی — میں پھر — پھر..."

"میں پھر کیا؟"

"میں پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گا۔"

"کیا مطلب — تو آپ جیل سے نکالے ہوئے ہیں — آپ جیل میں تھے — کسی نے آپ کو جیل سے نکالنے کے لیے آپ کا سب کچھ لے لیا — یہی بات ہے نا؟"

"ہاں! یہی بات ہے — لیکن خدا کے لیے اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔"

"آپ کو ہم ایک بات بتا دیتے ہیں — اور وہ یہ کہ جیل کا کوئی ملازم یہ کام نہیں کر سکتا — یا پھر کم از کم انھیں بدلے میں کسی اور کو جیل میں رکھنا پڑے گا، وہ بھی آپ کے میک اپ میں — کیا انھوں نے آپ کا میک اپ کسی کے چہرے پر کیا تھا؟" محمود نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔"
"آپ تھے کون سی جیل میں؟"
"میں نہیں جانتا۔ جیل بہرحال اسی شہر میں ہے۔
یہ کسی دوسرے شہر کا واقعہ نہیں ہے۔"
"آپ کا جرم کیا تھا؟"
"یہی تو مصیبت ہے۔ میں نے کوئی جرم قطعاً نہیں
کیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے پکڑ لیا گیا۔ اور جیل
میں ڈال دیا گیا۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس طرح کوئی کسی کو جیل
میں نہیں ڈال سکتا۔ عدالت میں بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔"
محمود نے کہا۔
"ہاں! انھوں نے عدالت میں بھی پیش کیا تھا۔ اور
میرا جرم بھی ثابت کیا تھا۔ جج نے مجھے عمر قید کی سزا
سنائی تھی۔"
"جرم کیا ثابت کیا تھا؟" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔
"انھوں نے ہیروئن کے کئی پیکٹ پیش کر کے بتایا
تھا کہ وہ میرے سامان سے برآمد ہوئے ہیں۔ میں نے
لاکھ شور مچایا کہ یہ جھوٹ ہے۔ فریب ہے۔ میرا
ہیروئن کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، لیکن جج نے



میری کسی بات پر یقین نہ کیا۔"
"اور آپ کے وکیل نے کچھ نہیں کیا؟"
"مجھے وکیل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ورنہ
شہر کا بہت بڑا وکیل میرا بہت اچھا واقف تھا۔
میں اسے پیروی کے لیے بلاتا، لیکن انھوں نے ایسا
کرنے ہی نہیں دیا اور فیصلے کے بعد جیل میں ٹھونس
دیا۔ میں قریباً ایک ماہ تک وہاں رہا۔ پھر جیل کے
ایک آدمی نے بات شروع کی کہ جیلر چاہے تو مجھے
ہمیشہ کے لیے اس جیل سے نکال سکتا ہے۔ ورنہ وہ
ساری زندگی جیل میں سڑتا رہے گا۔ سزا پوری ہونے
کے بعد بھی وہاں کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں نے پوچھا۔
جیلر مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً کہا۔ میری
ساری دولت۔
دولت کی اس وقت میرے نزدیک بالکل کوئی اہمیت
نہیں رہ گئی تھی۔ دولت میرے کس کام آئی تھی۔ میں
تمام دولت انھیں دینے پر تیار ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔"
یہاں تک کہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
"لیکن جیل میں رہتے ہوئے آپ نے انھیں ساری
دولت کس طرح دے دی؟"

"انھوں نے میری بیوی کے نام رقعہ لکھوایا — گھر سے
چیک بک وغیرہ منگوائی — میری بیوی تو پہلے ہی ایک
ماہ سے پریشان تھی — اس نے تو میری گمشدگی کی
رپورٹ تک پولیس اسٹیشن میں درج کروا رکھی تھی — جب
پولیس والے وہاں پہنچے تو وہ خود چیک بک لے کر جیل
تک آئی — اور پھر ہم خوب روئے — میں نے بنک
میں جو دولت موجود تھی — اس کا چیک کاٹ کر انھیں
دے دیا — کاروبار چند دن کے اندر فروخت کر کے
رقم ان کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا — جیلر نے واضح
کر دیا تھا کہ اگر میں نے کوئی دھوکا کرنے کی کوشش
کی تو وہ مجھے پھر بند کر دے گا — بلکہ مفرور قرار دلوا
دے گا — مجھے پھر گرفتار کر لیا جائے گا اور جیل میں
سزا اور بڑھ جائے گی — مجھے یہ سب کچھ منظور
نہیں تھا — میں نے گھر آ کر کاروبار جلد از جلد فروخت
کر ڈالا اور رقم ان کے حوالے کر دی — جس روز انھوں
نے مجھے جیل سے فارغ کیا تھا — اس روز سے دو
پولیس والے مسلسل سادہ لباس میں میرے ساتھ ساتھ
رہے تھے۔"

"اور انھوں نے آپ کو جیل سے کب نکالا — رات



کے وقت یا دن کی روشنی میں؟"

"رات کے وقت — انتہائی خفیہ انداز میں۔"

"ہوں! انھوں نے آپ کو گرفتار کس جگہ سے
کیا تھا؟"

"ہارون روڈ پر تیسرے کلومیٹر سے۔"

"شکریہ! آپ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کیجیے
گا — یعنی کسی کو یہ نہ بتائیے گا کہ آپ نے ہمیں کچھ
بتایا ہے — آپ کے ساتھ ضرور کوئی چکر چلایا گیا
ہے — آخر آپ کو وکیل کیوں نہیں کرنے دیا گیا —
جب کہ یہ قانون ہے — دوسرے یہ کہ کوئی جیلر اس
طرح کسی کو فارغ نہیں کر سکتا — یا پھر آپ کا کوئی
ہم شکل آپ کی جگہ جیل میں رکھا جاتا، کیونکہ جیل
کے قیدیوں کی روزانہ گنتی ہوتی ہے — کوئی ایک بھی
کم ہو تو فوراً ہل چل مچ جاتی ہے — آپ مستقل طور
پر کیسے جیل سے باہر رہ سکتے ہیں — بعض بے ایمان
جیلر ایسا تو کر لیتے ہیں کہ کچھ با اثر مال دار مجرموں کو
ہفتے میں ایک بار یا مہینے میں ایک آدھ بار ایک رات
کے لیے ان کے گھر بھیج دیتے ہیں اور لمبی چوڑی رقم
وصول کر لیتے ہیں — لیکن صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ

مجرم جیل میں واپس آ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے ، وہ
ضمانت کے طور پر مجرم نے کسی رشتے دار کو جیل میں
رکھتے ہوں ، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ مستقل طور پر کوئی
جیلر کسی کو باہر نکال دے۔"

"اس طرح تو آپ مجھے پھر جیل بھجوا دیں گے۔
اسی لیے میں آپ کو کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ انھوں نے
بھی یہی خطرہ ظاہر کیا تھا کہ اگر میں نے کسی سے
بھی ان باتوں کا ذکر کیا تو مجھے پھر جیل میں آنا پڑ
جائے گا۔ ہمارے ساتھ تو جو ہو گی سو ہو گی۔ لیکن
تم بہرحال جیل میں واپس آ جاؤ گے۔"

"ہاں ! یہ بھی ہے۔ خیر۔ ہم اس بارے میں آپ
کے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بنیں گے۔ آپ
فکر نہ کریں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

اور وہ وہاں سے رخصت ہو کر گھر کی طرف روانہ
ہوئے۔ دونوں سوچ میں گم تھے۔ ایسے میں محمود نے کہا:

"دھت تیرے کی۔ ہم نے اس کا نام وغیرہ تو
پوچھا ہی نہیں۔"

"تو چلو۔ اب پوچھ لیتے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔



وہ واپس پلٹے۔ دستک دی تو اس نے دروازہ کھولا:

"کیا آپ کی کوئی چیز رہ گئی ہے؟"

"نہیں۔ اتنی دیر تک آپ کے ساتھ بات چیت رہی،
لیکن ہم نے آپ سے آپ کا نام تک نہیں پوچھا۔"

"اوہ۔ میرا نام رجب میر ہے۔"

"شکریہ ! آپ کو وہ تاریخ تو یاد ہو گی۔ جس
تاریخ کو آپ کو سزا سنائی گئی تھی۔"

"وہ تاریخ تو میرے دماغ میں نقش ہے۔ ۱۲ دسمبر۔"
رجب میر نے کہا۔

"شکریہ ! بہت بہت۔"

"لیکن اب آپ نے یہ تاریخ کیوں پوچھی۔ میرا نام
کیوں پوچھا۔ جب کہ آپ اس بارے میں کچھ نہ کرنے
کا وعدہ کر چکے ہیں۔"

"ہم نے یہ وعدہ کیا ہے کہ آپ تک اس سلسلے
میں کوئی پریشانی نہیں آنے دیں گے۔"

"کیا مطلب۔ گویا آپ اس سلسلے میں تفتیش کریں گے۔"
اس نے خوف زدہ انداز میں کہا۔

"وہ تو ہمیں کرنا ہو گی۔ لیکن آپ کا ذکر تک
درمیان میں نہیں آنے کا۔ جب تک کہ آپ کے لیے

ہم کوئی خطرہ محسوس کریں گے ۔ اور جب آپ کے لیے
کوئی خطرہ دور دور تک نہیں رہ جائے گا تو پھر آپ کا
نام سامنے لائیں گے۔"

"اسی لیے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا ۔ لیکن آپ
نے مجھے باتوں میں اُلجھا کر سب کچھ پوچھ لیا ۔ اور اب
ایک بار پھر مجھ پر مصیبت آئے گی۔" اس نے پریشان
ہو کر کہا۔

"یہی تو آپ سمجھتے نہیں ۔ ہم کہ جو رہے ہیں کہ آپ
تک کسی پریشانی کو پھٹکنے بھی نہیں دیں گے ، بلکہ ..." محمود
کہتے کہتے رک گیا۔

"بلکہ کیا؟"

"بلکہ آپ کو آپ کی دولت واپس دلوا کر رہیں گے۔"

"میں دولت لے کر کیا کروں گا ۔ کہیں دولت لیتے
لیتے جیل نہ پہنچ جاؤں۔"

"اوّل تو ایسا ہو گا نہیں ۔ اگر کوئی صورت ایسی بن
بھی جائے گی تو ہم آپ کا کیس نئے سرے سے
لڑیں گے ۔ عدالت میں آپ کو بے گناہ ثابت کریں
گے اور اس جیلر کو عدالت میں کھینچیں گے جس نے آپ
سے دولت حاصل کی ہے ۔ اس سے تمام دولت واپس



لیں گے ۔ آپ پھر سے کارخانے کے مالک بن سکیں گے۔"

"یہ ایک خواب ہے ۔ جو میں دیکھ تو سکتا ہوں،
لیکن پورا نہیں ہو سکتا ۔ ہاں میں جیل ضرور چلا جاؤں
گا۔" اس نے حد درجے پریشان ہو کر کہا۔

"آپ ابھی نہیں سمجھیں گے ۔ اپنے گھر میں خاموشی
سے رہیں ۔ کوئی بات ہو تو ان نمبروں پر ہمیں فون
کریں ۔ ہم نہ ملیں تو پیغام ضرور نوٹ کروا دیں۔"

"اچھی بات ہے ۔ اللہ اپنا رحم کرے۔"

"ہاں ! بس آپ اللہ سے رحم مانگتے رہیں۔" فاروق نے
فوراً کہا۔

اور وہ وہاں سے چلے آئے ۔

"کیا خیال ہے ۔ گھر جانے سے پہلے جیل کا ایک چکر
نہ لگا لیں ۔ ہم کم از کم یہ تو دیکھ لیں کہ ۱۳ دسمبر کو اسے
اس جیل میں لایا گیا تھا یا نہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے ۔ کچھ کر کے گھر جائیں گے تو فرزانہ
مذاق تو نہیں اڑائے گی۔"

"فرزانہ کے مذاق کی بات چھوڑو ۔ ابا جان جو ہمیں
آڑے ہاتھوں لیں گے۔"

"اور امی جان۔"

"وہ تو صرف اس بات پر بگڑیں گی کہ ہم چائے کے وقت گھر کیوں نہیں پہنچے۔" فاروق مسکرایا۔

اور پھر وہ جیل پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے کارڈ اندر بھیجے۔ جیلر نے انھیں فوراً بلا لیا۔ ان کا نام کاظم بیگ تھا۔ لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم جسم کے مالک۔ کافی بارعب لگتے تھے۔

"آئیے بھئی آئیے۔ کیسے تکلیف کی؟" انھوں نے مسکرا کر خوش اخلاق انداز میں کہا۔

"شکریہ جناب! ہمیں ذرا قیدیوں کا رجسٹر دیکھنا ہے۔"

"ابھی منگوا دیتا ہوں، لیکن معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کیا ہے۔ یہ تو ابھی ہمیں بھی نہیں معلوم۔"

"ہوں خیر۔" انھوں نے کہا اور گھنٹی بجا دی۔

پولیس کی وردی میں ایک شخص اندر داخل ہوا:

"قیدیوں والا رجسٹر لے آؤ بھئی۔"

"نیا یا پرانا؟"

"بے وقوف۔ جب صرف اتنا کہا جائے کہ قیدیوں کا رجسٹر لے آؤ تو نیا رجسٹر مراد ہوتا ہے۔ ورنہ ساتھ میں بتایا جائے گا کہ کون سے سن کا رجسٹر چاہیے۔"

"اوہ یس سر۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا۔



"اور سنو مراد خان۔ ذرا چائے کا بھی کہہ دینا۔"

"نہیں سر۔ ہم چائے نہیں پییں گے۔"

"تو ٹھنڈا منگوا لیتے ہیں۔"

"جنوری میں اور ٹھنڈا۔ ہمیں نمونیے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں کیا؟"

"تو پھر چائے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ ہم صرف اپنے وقت پر چائے پیتے ہیں۔"

"اچھا خیر۔ مراد خان۔ صرف رجسٹر لے آؤ۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔

جلد ہی وہ ایک موٹا سا رجسٹر لے آیا۔ انھوں نے رجسٹر دیکھنا شروع کیا۔ لیکن یہ رجسٹر یکم جنوری سے تھا۔ اور انھیں ۱۳ دسمبر کا اندراج دیکھنا تھا۔

"معاف کیجیے گا جناب۔ گزشتہ سال کا بھی منگوا ہی لیں۔"

"پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"ہم سے بھول ہو گئی۔"

"خیر۔" انھوں نے کہا اور گھنٹی بجائی۔ مراد خان پھر آ حاضر ہوا:

"پچھلا رجسٹر بھی لے آؤ۔"

"میں نے تو پہلے ہی پوچھا تھا۔"

"ان سے بھول ہو گئی — تم جاؤ۔" انھوں نے جھنا کر کہا۔
اور مراد خان بُرا سا منہ بنا کر چلا گیا — جلد ہی وہ
ایک اور رجسٹر لے کر اندر آیا — اب انھوں نے اس رجسٹر
میں دیکھنا شروع کیا — ۱۲ دسمبر کی تاریخ میں انھیں کسی رجب میر
کا نام نظر نہ آیا۔

"نئے قیدی جو آتے ہیں — کیا وہ اس رجسٹر میں درج نہیں
کیے جاتے؟"

"اس میں روزانہ کی کارروائی درج کی جاتی ہے۔ اگر
کوئی نیا قیدی آتا ہے تو اس کا نام درج کر کے ٹوٹل
میں شامل کیا جاتا ہے — کوئی قیدی رہا کیا جاتا ہے تو اس
کا نام درج کر کے ٹوٹل میں سے تفریق کیا جاتا ہے۔" جیلر
کاظم بیگ نے بتایا۔

"شکریہ!" دونوں ایک ساتھ بولے۔

اب انھوں نے گیارہ، بارہ اور تیرہ دسمبر کی تاریخوں
میں رجب میر کا نام دیکھ ڈالا — لیکن یہ نام انھیں
کہیں بھی نظر نہ آیا — انھوں نے مزید چند تاریخیں بھی دیکھ
ڈالیں — یہ دیکھ کر کاظم بیگ نے کہا:

"آخر آپ کیا دیکھ رہے ہیں — کچھ مجھے بھی تو بتائیں،
شاید میں آپ کا مسئلہ حل کر سکوں۔"



"ابھی ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" ان کا منہ بن گیا۔

"بہت جلد آپ سے ملاقات کریں گے اور بتائیں گے۔"

"آپ تو مجھے اُلجھن میں مبتلا کیے دے رہے ہیں۔"

"یہ ہماری مجبوری ہے — آپ کو کچھ دیر تو انتظار کرنا
ہی ہو گا — ویسے ہو سکتا ہے — ہم فوراً ہی یہاں آ جائیں۔"

"ضرور جناب — کیوں نہیں۔" وہ بولے۔

دونوں کاظم بیگ کو اُلجھن کے عالم میں چھوڑ کر باہر
نکل آئے —

# یہی سمجھ لیں

"۱۲ دسمبر کی تاریخ میں رجب میر کا نام موجود نہیں
ہے۔ اس کے چند دن آگے پیچھے کی تاریخوں میں بھی
نہیں ہے۔ آخر کیوں؟" محمود نے بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔
"یار یہ کیوں بہت خوفناک ہے۔ کہیں رجب میر کسی
الجھن کا شکار نہ ہو جائے۔"
"ہاں! ہمیں پہلے اس کی حفاظت کا انتظام کر دینا
چاہیے۔ کیونکہ یہ چکر ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"
"او کے۔" فاروق نے کہا اور موبائل فون کے ذریعے
سب انسپکٹر اکرام کے نمبر ملائے:
"السلام علیکم!" فاروق نے اس کی آواز سن کر کہا۔
"کوئی کیس شروع ہو گیا کیا؟" اکرام نے بوکھلا کر کہا۔
"یہی سمجھ لیں۔"
"سمجھ لیں کا مطلب ہے۔ واقعی شروع ہو گیا ہے۔"



اکرام نے بوکھلا کر کہا۔
"یہی سمجھ لیں۔" فاروق مسکرایا۔
"حد ہو گئی۔ اچھا بتائیں۔"
"رجب میر۔ ۳۰۴ غازی آباد۔ اس کی اور اس کے
گھر والوں کی حفاظت کے لیے دو سادہ لباس والے
فوری طور پر مقرر کر دیں۔"
"اچھی بات ہے۔ کیا یہ لوگ خطرے میں ہیں؟"
"یہی سمجھ لیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔
"بہت بہتر۔ سمجھ لیا یہی۔" اس نے جھلا کر کہا اور
فاروق نے فون بند کر دیا۔
آخر وہ گھر کے دروازے پر پہنچے۔ جونہی محمود نے
گھنٹی بجائی۔ فرزانہ نے دروازہ کھولا اور چہک کر بولی:
"ہائیں۔ یہ تمہارے چہروں پر کیس کیوں بج رہا ہے؟"
"کیس کیوں بج رہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟"
"کچھ لوگ کہتے ہیں نا۔ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں
بج رہے ہیں۔ سو میں نے کہہ دیا کہ کیس کیوں بج
رہا ہے۔"
"تم نے کس طرح اندازہ لگا لیا کہ ہم کسی کیس سے
دو چار ہو چکے ہیں؟"

"دو چار نہیں — چار آٹھ — کیونکہ تم ڈیڑھ گھنٹا لیٹ پہنچے ہو — اگر تم کسی کیس سے دو چار یا چار آٹھ نہیں ہوئے ہو تو اس ڈیڑھ گھنٹے کی وضاحت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ — اس لیے کہ ابا جان آج بہت زیادہ غصے میں ہیں۔"

"ارے باپ رے — اگر ہم دروازے پر ہی کھڑے رہے تو تم نکال لو گی ہماری جان۔"

"وہ تو ایک دن ویسے بھی نکلے گی۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تو پھر مہربانی فرما کر تم یہ کارنامہ پہلے ہی انجام دینے کی کوشش نہ کرو۔"

"کک — کون سا کارنامہ؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جان نکالنے والا — ملک الموت تو جب نکالیں گے، نکالیں گے — تم پہلے ہی کیوں نکالے دے رہی ہو۔" فاروق نے جھنا کر کہا۔

تینوں اندر داخل ہوئے —

"یہ کیا — تم جیل سے آ رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے چونک کر کہا۔

"ہائیں — تو کیا جیلر صاحب نے آپ کو بھی فون کر دیا؟" فاروق چونکا۔



"فون — جیلر — کیا کہہ رہے ہو — مجھے کسی جیلر نے فون وون نہیں کیا — فرزانہ، بتاؤ انھیں۔" انھوں نے جلدی جلدی کہا۔

"جب سے ابا جان گھر آئے ہیں — کسی کا فون نہیں آیا۔" فرزانہ مسکرائی۔

"تب پھر آپ نے کیسے جان لیا کہ ہم جیل سے آ رہے ہیں؟"

"تمھارے بالوں پر نیلا رنگ لگا ہوا ہے — اور نیلا روغن آج کل جیل کے دروازوں پر کرایا جا رہا ہے — کسی اور عمارت کے دروازوں پر نہیں کرایا جا رہا۔"

"اوہ — شاید ہم اندر داخل ہوتے وقت اپنے بالوں کو چھونے سے نہیں بچا سکے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"لیکن تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟"

"جی — وہ — بس یوں سمجھ لیں — ہم نے ایک کیس مول لے لیا ہے۔"

"چلیے خیر — مفت تو نہیں لیا — کچھ پیسے تو کما کر لاؤ گے۔" فرزانہ نے شوخ آواز میں کہا۔

"تم چپ نہیں رہ سکتیں۔"

"اگر کہتے ہو تو رہ لوں گا — لیکن یہ بتا دو —

کتنی دیر؟"

"ایک منٹ فرزانہ — ہاں تم جلدی جلدی اپنی کہانی سنا دو۔"

"اپنی نہیں — رجب میر کی۔"

"یہ کیا نام ہوا؟"

"جی بس! اس کا نام یہی ہے۔"

"تو اس نے تم دونوں کو جیل کی کوئی کہانی سنائی ہے۔" انھوں نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"گویا اب مجھے بھی وہ کہانی سننا پڑے گی، کیونکہ تم بہت الجھے ہوئے نظر آ رہے ہو۔"

"جی ہاں! یہ تو ہے۔"

"اچھی بات ہے — فرزانہ تم بھی ان کی کہانی غور سے سنو۔"

"جی بہت بہتر!" فرزانہ نے کہا۔

"بلکہ بہت غور سے۔" فاروق مسکرایا۔

انھوں نے نیشنل پارک میں رجب میر کی ملاقات سے کہانی شروع کی اور جیل پر لا کر ختم کی۔ انسپکٹر جمشید چند لمحے تک سوچتے رہے، پھر بولے:



"کیس بہت دلچسپ ہے — اور رجب میر ضرور مظلوم نظر آتا ہے — تم نے اچھا کیا، اس کی حفاظت کے لیے سادہ لباس والے بھجوا دیے — سوال یہ ہے کہ اب اس سلسلے میں ہم کیا کریں؟"

"پہلا سوال — آخر اس کا نام جیل کے رجسٹر میں کیوں نہیں ہے؟"

"آؤ دیکھتے ہیں — یوں کام نہیں چلے گا۔" وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جی — کیا مطلب؟"

"آؤ۔" وہ بولے۔

وہ گھر سے نکل کر رجب میر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب اس کے گھر کے سامنے پہنچے — تو انسپکٹر جمشید نے خاص انداز میں ہاتھ ہلایا — ایک سادہ لباس والا تیر کی طرح ان کی طرف آیا:

"کوئی اس کے گھر میں آیا گیا تو نہیں؟"

"جی نہیں۔" اس نے بتایا۔

اور وہ دروازے پر پہنچ گئے — دستک دی تو رجب میر نے دروازہ کھولا:

"اوہ! آپ لوگ پھر آ گئے۔"

"ہاں ! اس بار ہمارے والد صاحب بھی ساتھ ہیں۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں — آئیے — اندر آجائیے۔" رجب میر نے کہا۔

"نہیں — آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے — اگر کپڑے وغیرہ تبدیل کرنا ہیں تو کر لیں۔"

"میرے پاس اس سے بہتر کپڑے نہیں ہیں۔"

"تو پھر اسی طرح چلیں۔"

"جانا کہاں ہے؟"

"آپ کا انتقام لیں گے — بس آپ خاموشی سے دیکھتے جائیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے پھر ہاتھ اسی انداز میں اٹھایا — سادہ لباس والا پھر آ گیا :

"ان کے گھر والوں کو ہمارے گھر پہنچا دو — یہ وہاں زیادہ حفاظت سے رہیں گے اور جب تک یہ معاملہ حل نہیں ہو جاتا — مسٹر رجب میر آپ بھی ہمارے گھر رہیں گے — اب آپ اپنے بیوی بچوں سے کہہ دیں — کہ وہ ان کے ساتھ چلے جائیں۔"

"جی بہتر!"

"بلکہ پہلے ہم انھیں خود وہاں چھوڑ آتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے —



"یہ ٹھیک رہے گا۔"

رجب میر کے گھر کے افراد کو اپنے گھر چھوڑ کر وہ جیل پہنچے — کاظم بیگ نے انھیں حیرت زدہ نظروں سے دیکھا، پھر بولے :

"خیر تو ہے؟"

"ان صاحب کو دیکھیے — یہ ایک ماہ تک جیل میں رہے ہیں۔"

"کیا فرمایا آپ نے — یہ جیل میں رہے ہیں ایک ماہ تک — نہیں ہرگز نہیں۔"

"کیا فرمایا آپ نے — یہ جیل میں نہیں رہے؟" انسپکٹر جمشید نے بھی حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں ! نہیں رہے۔"

"اوہ ! لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے — انھیں آج سے قریباً ایک ماہ پہلے ہارون روڈ سے پولیس نے گرفتار کیا — حوالات میں رکھا — پھر انھیں عدالت میں پیش کیا گیا جو کہ فوری سماعت کی تھی — پولیس نے ہیروئن پیش کی — اس کا کہنا تھا کہ وہ ہیروئن ان کے پاس سے برآمد ہوئی ہے — اس طرح جج نے انھیں عمر قید کی سزا سنائی — پھر یہ ایک ماہ تک جیل میں رہے۔"

"اور اس کے بعد۔ پھر کیا ہوا۔ یہ تو جیل سے باہر نظر آ رہے ہیں۔"

"وہ ایک الگ کہانی ہے۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ یہ جیل میں رہے ہیں یا نہیں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ انھیں سارے عملے کو دکھا لیں۔ عملے کا ایک آدمی بھی اگر یہ کہ دے کہ یہ جیل میں رہے ہیں تو میں مجرم۔ یا پھر خود ان سے پوچھ لیں۔"

"ان سے کیا پوچھ لیں؟"

"جیل اندر سے دکھا کر ان سے پوچھیں۔ یہ کون سی کوٹھری میں رہے ہیں۔ عملے میں سے یہ کس کس کو پہچانتے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تو پھر آیئے۔ میں آپ کو جیل کے اندرونی حصے میں لے چلتا ہوں۔" انھوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا، پھر بولے:

"اگر میں سگریٹ پیوں تو آپ کو اس کی بو ناگوار تو نہیں گزرے گی؟"

"نہیں۔ آپ شوق سے پییں۔"



پھر وہ ان کے ساتھ جیل کے اندر پہنچے۔ جیل کے اندر والے حصے کو دیکھ کر رجب میر بُری طرح چونکا:

"نہیں نہیں۔ یہ وہ جیل نہیں ہے۔ جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ سب ایک ساتھ چونکے۔

"جی ہاں! مجھے اس جیل ہرگز نہیں رکھا گیا۔"

"لیکن ہمارے شہر میں تو بس یہی ایک جیل ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر مجھے کہاں رکھا گیا تھا؟" رجب میر نے کہا۔

"ایک منٹ۔ اس جج کا نام کیا تھا۔ جس کی عدالت میں آپ کو پیش کیا گیا؟"

"ان کا نام جج ساہو شاہ تھا۔"

انسپکٹر جمشید نے کچہری کے رجسٹرار کو فون کیا اور اس سے بات کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

"اس نام کا کوئی جج ہمارے شہر میں نہیں لگا ہوا۔ کبھی بھی نہیں لگا رہا۔"

"اُف میرے مالک! پھر یہ سب کیا ہے؟"

"یہ تو ہمیں معلوم کرنا ہو گا۔ بہرحال۔ اس معاملے

کا اس جیل سے اور جیل کے عملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
لہٰذا ہمیں اب یہاں سے چل دینا چاہیے۔ اور کاظم بیگ
صاحب۔ ہم معافی چاہتے ہیں۔ آپ کو زحمت دی۔"

"لیکن اس میں آپ کا بھی کیا قصور۔"

اور پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گئے:

"آپ اب تک کیا سمجھے ہیں ابا جان؟"

"یہ کہ ہمارے شہر میں کوئی مصنوعی جیل ہے۔ مصنوعی
عدالت ہے۔ مصنوعی پولیس والے ہیں۔ وہ اس طرح
کسی دولت مند کو پکڑ لیتے ہیں اور اس کی ساری دولت چھین
لیتے ہیں۔"

"لیکن وہ جیل کہاں ہے۔ وہ عدالت کہاں ہے؟"

"ہمیں تلاش کرنا ہو گی۔ اس ظلم کو ختم کرنا ہو گا۔
ورنہ نہ جانے کتنے لوگ ان کے ظلم کا شکار ہو جائیں۔"

"اُف مالک! تو وہ سب کچھ مصنوعی تھا؟"

"ہاں! یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک جیلر کسی قیدی کو
رہا کر دے۔"

"یا اللہ! اب میں کیا کروں؟"

"اب آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا
ہے۔ کرنے کا کام اب ہمارا ہے۔ ان لوگوں کا سُراغ



لگائیں گے۔ بے گناہوں کو ان کی مصنوعی جیل سے نجات
دلائیں گے اور ان کی دولت بھی واپس دلوائیں گے۔"

"دولت ان لوگوں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہو گی؟"

"جس قدر واپس حاصل کر سکیں گے۔ وہ تو آپ
کو ملے گی نا۔"

"اچھا خیر۔" اس نے کہا۔

وہ گھر آ گئے۔ اور لگے سوچنے کہ اب کیا کریں۔
انھوں نے فرزانہ سے بھی کہا کہ کوئی ترکیب سوچے۔ فرزانہ
سوچ میں ڈوب گئی۔ آخر اس نے انھیں ایک ترکیب بتائی،
ترکیب سُن کر وہ اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں چمک اُٹھیں،
انسپکٹر جمشید نے فوراً خان رحمان کے نمبر ملائے۔
ساری صورتِ حال انھیں بتائی، پھر فرزانہ کا پروگرام
انھیں بتایا۔ وہ بھی خوش ہو گئے، پھر بولے:

"لیکن پروفیسر صاحب کے بغیر مزا نہیں آئے گا۔"

"چلو انھیں بھی شامل کر لیتے ہیں۔"

اور پھر پروفیسر داؤد کو بھی فون کیا گیا۔ وہ بھی ان
کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئے۔

دوسرے دن کے اخبارات نے ایک خبر شائع کی۔
خبر یہ تھی:

"ہیروں کے ایک سوداگر کی دارالحکومت میں آمد۔
دارالحکومت ) ہیروں کے ایک بڑے سوداگر دارالحکومت
میں آئے ہوئے ہیں ۔ ان کے پاس بہت نایاب
ہیرے ہیں ۔ صرف دو دن ان کا قیام رہے
گا ۔ ہیروں کے شوقین ان سے ہوٹل انٹرنیشنل میں
رابطہ کر سکتے ہیں ۔ کل رات نو بجے وہ دارالحکومت
سے رخصت ہو جائیں گے۔"



# قانونی تقاضا

ہوٹل انٹرنیشنل کے کمرہ نمبر ۱۰۲ میں اس وقت ہیروں
کے سوداگر خان بہادر خان موجود تھے ۔ ان کے ساتھ
ان کے دو دوست اور ایک دوست کے تین بچے بھی تھے ۔
ایک میز پر ہیروں کا بکس رکھا تھا ۔ اس میں ان گنت
ہیرے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے ۔ ایسے میں
دستک ہوئی ۔

"تشریف لے آئیے۔" خان بہادر خان بولے ۔

دروازہ کھول کر ایک لمبے قد کا آدمی اندر داخل ہوا،
اس کے جسم پر بہت قیمتی لباس تھا ۔ ہاتھوں میں ہیروں
کی انگوٹھیاں تھیں ۔ اس کی ناک بہت زیادہ لمبی تھی ۔

"میں نے اخبار میں آپ کی آمد کی خبر پڑھی تو یہاں
آنے کے لیے بے چین ہو گیا ۔ مجھے امید ہے آپ مجھے
ہیرے دکھانا پسند کریں گے۔"

"ضرور کیوں نہیں۔"

وہ میز کے گرد جا بیٹھے — خان بہادر کے باقی ساتھی وہیں بیٹھے اپنی باتوں میں مشغول رہے — خان صاحب انہیں ہیرے دکھانے لگے — وہ ان کی قیمتیں پوچھتے رہے، خان بہادر بتاتے رہے — آخر وہ اُٹھتے ہوئے بولے:

"یہ تو بہت زیادہ قیمتی ہیں، میری ہمت سے باہر — امید ہے، معاف فرمائیں گے۔"

"اوہ! کوئی بات نہیں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

ان کے جانے کے بعد خان بہادر نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا:

"ان کے بارے میں کیا خیال ہے جمشید؟"

"وہ ایک ہیرا اڑا لے گیا ہے۔"

"ارے — اچھا۔" خان بہادر چونکے۔

"ہاں! اور میں نے اسے جانے دیا — ظاہر ہے — وہ یہ ہیرا بازار لے جا کر کسی جوہری سے چیک کرائے گا اور ہیرا اصل ہونے کی صورت میں وہ جان لے گا کہ ہم موٹی آسامی ہیں۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"اس وقت تک جتنے آدمی ہیرے دیکھنے آئے ہیں —



ان میں سے ہیرا صرف اس لمبی ناک والے نے چرایا ہے، مطلب یہ کہ یہ آدمی ہو سکتا ہے — مصنوعی جیل والوں کا ساتھی ہو۔"

"اُمید پر دُنیا قائم ہے — ابھی اور لوگ بھی تو آئیں گے۔"

"ہاں ضرور — کیوں نہیں۔"

رات تک لوگ آتے رہے — ہیرے دیکھتے رہے اور وہ ہیرے دکھاتے رہے — کچھ ہیرے فروخت بھی ہو گئے — اور آخر رات زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے — ملاقات کے لیے آنے والوں میں سے صرف ایک نے ایک ہیرا چرایا تھا — اور کسی نے ایسی کوشش نہیں کی تھی — دوسرے دن بھی ان کے پاس آنے والوں کا تانتا لگا رہا — اور پھر رات ہونے پر انھوں نے اپنا سامان سمیٹا اور رخصت ہوتے — خان رحمان کی بڑی گاڑی کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا اور نمبر پلیٹ بدل دی گئی تھی — لہٰذا اب انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا — اب ان کا سفر ماروِن روڈ پر شروع ہوا — شہر سے باہر جانے کے لیے سبھی گاڑیوں کو ماروِن روڈ سے گزرنا پڑتا تھا — ابھی انھوں نے دو اڑھائی کلومیٹر ہی راستا طے کیا ہو گا کہ ٹارچ کی روشنیاں گاڑی پر پڑی

گئیں — یہ اشارہ تھا کہ گاڑی روک لو — پولیس چیکنگ کرنا چاہتی ہے۔"

"آ گئے شکاری۔" فاروق بولا۔

"شکاری یا شکار۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"فی الحال تو یہ شکاری ثابت ہوں گے — جب شکار ہوں گے، تب کی بات ہے۔"

"اور یہ اپنا جال بھی ساتھ لاتے ہوں گے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"ہر شکاری جال نہیں لگاتا — جیسے انکل منور علی خان۔"

"وہ تو عجیب و غریب قسم کے جال بچھاتے ہیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

اور پھر گاڑی رک گئی — سامنے تین چار پولیس والے کھڑے تھے اور کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے پولیس کی گاڑی تھی — اس کی نیلی روشنی برابر گھوم رہی تھی۔

"یس سر — کیا حکم ہے؟" خان رحمان نے منہ باہر نکال کر کہا۔

"گاڑی کو چیک کریں گے — آج کچھ گاڑیوں پر ہیروئن لے جائے جانے کی اطلاعات ملی ہیں — لہٰذا ہم ہر گاڑی کو چیک کر رہے ہیں۔"



"اوہ اچھا — لیکن آپ یقین کریں — ہمارا ہیروئن کے کاروبار سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔" خان رحمان بولے۔

"آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟"

"میں ہیروئن سے بھی زیادہ مہنگی چیز کا بیوپاری ہوں، یعنی ہیروں کا۔"

"اوہ اچھا — لیکن ہمیں ہر گاڑی کی تلاشی کی ہدایات ہیں — تلاشی تو ہمیں لینا ہوگی۔"

"جیسے آپ کی مرضی — ہم کیا کر سکتے ہیں۔" انھوں نے کندھے اچکائے۔

"آپ لوگ نیچے اتر آئیں۔"

"لیکن جناب! اس کے لیے نیچے اتر آنے کی کیا ضرورت ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے — وہ بھی سیدھے سادے کاروباری آدمی کے میک اپ میں تھے۔

"ضرورت ہے — آپ نیچے اتر آئیں۔"

"جی بہتر۔" وہ بولے۔

اور پھر وہ نیچے اتر آئے — ان کی جامہ تلاشی لینے کے لیے کانسٹیبل ابھی آگے بڑھے ہی تھے کہ انسپکٹر جمشید بول اٹھے:

"ایک منٹ جناب! پہلے قانونی تقاضا پورا کریں۔"

"قانونی تقاضا — کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پہلے آپ اپنی تلاشی دیں۔"

"اوہ اچھا — ضرور کیوں نہیں — تلاشی لے سکتے ہیں آپ۔"

انھوں نے کانسٹیبلوں کی تلاشی لی — ان کے پاس ہیروئن نہیں تھی — پھر وہ انسپکٹر کی طرف بڑھے:

"آپ بھی تلاشی دے دیں سر۔"

"نہیں! آپ لوگ میری تلاشی نہیں لے سکتے — اس لیے کہ میں آپ لوگوں کی یا آپ کی کار کی تلاشی نہیں لوں گا۔"

"اچھی بات ہے۔"

کانسٹیبل کار میں داخل ہو گئے — اور پھر ایک منٹ کے اندر اندر انھوں نے کار میں سے ہیروئن کی تھیلیاں نکال دیں:

"ارے! یہ کیا؟" وہ واقعی حیرت زدہ رہ گئے۔

"ہیروئن — اسی کی ہمیں اطلاع ملی تھی جناب۔"

"بہت خوب! آپ کی کارکردگی کا قائل ہونا پڑتا ہے بھئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر نے چونک کر کہا۔

"میرا مطلب ہے — آپ نے تو ایک منٹ کے اندر



اندر ہیروئن تلاش کر دی — اور ہم نے رخصت ہونے سے پہلے دس منٹ تک گاڑی کی تلاشی لی تھی، لیکن یہ پیکٹ اس وقت اس میں نہیں تھے۔"

"یہ ہوتے بھی کیسے — یہ تو آپ لوگوں نے کار میں بعد میں رکھے ہوں گے۔"

"سچ بات یہ ہے کہ ان پیکٹوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، لیکن اب آپ مانیں گے کہاں۔"

"ہاں! یہ تو ہے — آپ کو پہلے حوالات لے جائیں گے، پھر عدالت میں پیش کیا جائے گا — آج کل ہیروئن کے کیسوں کے جلد فیصلے کے لیے ایک فوری سماعت کی عدالت قائم کی گئی ہے — آپ کو اس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔"

"ضرور — کیوں نہیں۔"

انھیں انھی کی گاڑی میں ایک پولیس اسٹیشن تک لایا گیا — پولیس اسٹیشن کو دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی — وہ شہر سے باہر غیر آباد جگہ پر تھا — اور وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان لوگوں نے اس جعل سازی کے لیے اس قدر شان دار تھانہ بھی بنوایا ہوگا — بہرحال انھیں حوالات میں ڈال دیا گیا:

"ابھی تک ہمیں ہمارے وکیل سے فون پر بات نہیں کرائی گئی"۔ انسپکٹر جمشید بولے۔

"کرا دی جائے گی۔ فکر نہ کریں"۔

ان کے ہیرے اور دوسرا سامان قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ ہیرے وہ پہلے ہی اچھی طرح گن کر چکے تھے۔ تمام رات ان سے کوئی بات نہ کی گئی۔ نہ کھانے کو کچھ دیا گیا۔ صبح بھی ناشتے کے بغیر ہی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس دوران انسپکٹر جمشید نے کہا:

"آپ نے ابھی تک ہماری بات ہمارے وکیل سے نہیں کرائی۔ اور ہمیں کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا گیا۔ ہم یہ بات عدالت کو بتائیں گے"۔

"ضرور بتائیے گا"۔

اور وہ عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑے کیے گئے۔ چند منٹ بعد جج بھی عدالت کی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے جج کو بغور دیکھا۔ عدالت کے ماحول کو باقاعدہ دیکھا۔ وہ ہر طرح سے مکمل عدالت تھی۔ اس سے مصنوعی پن بالکل نہیں جھلک رہا تھا۔ حوالات سے اس عدالت تک انھیں بند گاڑی میں لایا گیا تھا۔



اور بند گاڑی نے راستے میں ان گنت چکر کاٹے تھے، اس لیے۔ وہ یہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ یہ عدالت شہر کے کس حصے میں ہے۔ البتہ حوالات کا اندازہ لگا چکے تھے۔ کیونکہ وہاں تک تو انھیں ان کی کار میں ہی لایا گیا تھا۔

جج کے سامنے ان کے جرم کی تفصیل بیان کی گئی، جج سنتا رہا، نوٹ لیتا رہا، پھر وہ ہیروئن بھی پیش کی گئی۔ جو ان کی کار سے برآمد کی گئی تھی۔

"آپ لوگ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں! پہلی بات تو یہ کہ ہمیں وکیل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ کیا یہ ہمارے ملک کا قانون نہیں ہے کہ ملزم کو وکیل کی سہولت دی جائے"۔

"ہاں! یہ قانون ہے۔ لیکن یہ فوری سماعت کی عدالت ہے، وکیل لوگ سماعت کو بہت لمبا کر دیتے ہیں۔ اگر آپ کی کار میں سے ہیروئن برآمد نہیں ہوئی تو بات کریں، یہاں وکیل کی ضرورت نہیں ہے"۔

"یہ آپ کا کہنا ہے، ہمارا نہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے، ہمیں وکیل کرنے کی مہلت دی جائے"۔

"افسوس۔ یہ مہلت نہیں دی جا سکتی۔ ہیروئن کے

کاروبار کو ہمیں اپنے ملک سے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔
اگر ہم وکیلوں کے چکروں میں پڑے رہے تو کام نہیں ہو
سکے گا۔"

"اچھی بات ہے، ہم آپ کو بھی ہائی کورٹ میں چیلنج کریں گے۔"

"چیلنج تو اس وقت کریں گے نا جب یہاں سے نکل
کر جائیں گے۔" جج نے کہا۔

"کیوں — کیا ہم نکل کر نہیں جا سکیں گے؟"

"ناممکن — میں تم لوگوں کو عمر قید کی سزا دے رہا ہوں۔"

"تو عمر قید بھی تو ختم ہو جاتی ہے سر۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہیروئن کے کیس کی عمر قید ختم نہیں ہوتی۔" جج نے
منہ بنایا اور پولیس کو اشارہ کیا کہ انھیں لے جائیں۔

انھیں عدالت سے باہر لے جایا گیا — اور پھر بند گاڑی
میں بٹھا کر جیل تک لایا گیا — وہ اس جیل کو دیکھ کر
بھی بہت حیران ہوئے — کیونکہ یہ باقاعدہ جیل تھی —
یہاں بھی کوئی مصنوعی پن نہیں جھلک رہا تھا — گویا ان
لوگوں نے اپنے جرم کے لیے بہت محنت کی تھی۔

جیل کے رجسٹر میں ان کے نام وغیرہ لکھے گئے — پھر
انھیں ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

"لو بھئی — جیل میں تو ہم پہنچ گئے۔" خان رحمان بولے۔



"اب کتنے دن یہاں رہنے کا پروگرام ہے؟" پروفیسر داؤد بولے۔

"ذرا تیل دیکھ لیں — تیل کی دھار دیکھ لیں۔" انسپکٹر جمشید
نے کہا۔

"جیل میں تیل — کیا کہہ رہے ہیں ابا جان؟" محمود نے
حیران ہو کر کہا۔

"اور جمشید — یہ لوگ کھانے کو تو دیں گے نا۔" پروفیسر
داؤد بولے —

وہ مسکرا دیے —

"ضرور دیں گے — آپ فکر نہ کریں۔" انھوں نے کہا۔

عین اس وقت بھاری قدموں کی آواز سنائی دی —

# چاقو نکالو

انھوں نے دیکھا — لمبے قد کا ایک شخص چلا آ رہا تھا، کوٹھری کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا — اس کے پیچھے دس بارہ کانسٹیبل تھے :

" یہ ہمارے جیلر ہیں۔" جیل کے ایک ملازم نے گویا تعارف کروایا۔

" ان سے مل کر خوشی ہوئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" لیکن مجھے نہیں ہوئی — میں ہیروئن کا کاروبار کرنے والوں سے مل کر ہرگز خوش نہیں ہوتا۔"

" تب تو آپ کو ہم سے مل کر خوش ہونا چاہیے جناب۔" فاروق نے فوراً کہا۔

" کیا مطلب ؟"

" ہمارا ہیروئن کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں — ہم اس معاملے میں بالکل بے گناہ ہیں۔"



" ہر کوئی یہی کہتا ہے — خیر — کچھ دن بعد خود ہی مان جاؤ گے — اب تو تمھیں اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ یہاں گزارنا ہے۔"

" تو آپ یہاں کے جیلر ہیں ؟" محمود نے پوچھا۔

" ہاں ! بالکل۔"

" آپ کا کیا نام ہے جناب ؟"

" ابرار بارو۔"

اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا —

" تو یہ یہاں کے جیلر ہیں۔"

دوسرے دن صبح ان سب کو کوٹھریوں سے نکالا گیا — انھوں نے دیکھا — وہاں کل تین سو کے قریب قیدی تھے — وہ حیرت زدہ رہ گئے — تین سو آدمیوں کی گم شدگی سے آخر شہر میں ہل چل کیوں نہیں مچی — اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ صرف دارالحکومت کے نہیں تھے — بلکہ مختلف شہروں کے تھے — ان سب کی حاضری لی گئی، پھر ناشتا دیا گیا —

ناشتے میں بھنے ہوئے چنے اور گڑ دیا گیا — جب یہ ناشتا ان کے سامنے آیا تو پروفیسر داؤد بے ساختہ انداز میں بولے :

"یہ — یہ کیا ہے؟"

"یہ ناشتا ہے انکل۔"

"چنے اور گڑ!" وہ بولے۔

"جی ہاں! جیل میں تو ایسا ہی ناشتا مل سکتا ہے۔"

"دھت تیرے کی۔" پروفیسر داؤد نے جھنجھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا اور وہ سب مسکرا دیے۔

لیکن پھر انھیں وہی ناشتا کرنا پڑا اور سچ تو یہ ہے کہ ان چنوں اور گڑ نے بہت مزا دیا۔

"بھئی واہ مزا آ گیا — ایک زمانے کے بعد ایسا لذیذ ناشتا ملا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہاں بس — گزارا ہو گیا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

ناشتے کے بعد سب قیدیوں کو کام پر لگا دیا گیا — کسی کے ذمے پودوں کو پانی دینا لگایا گیا تو کسی کے ذمے صفائی کا کام — غرض مختلف قسم کے کام ان میں تقسیم کر دیے گئے — ان کے ذمے تمام قیدیوں کے گھڑے بھرنے کا کام لگایا گیا — گویا تمام کوٹھریوں کے خالی گھڑے انھیں بھرنے تھے —

"آئیے پروفیسر صاحب، ذرا گھڑے بھریں۔"

"تت — تو — اب میں بھی گھڑے بھروں گا؟"



"مجبوری ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اچھا بابا۔" انھوں نے جھلا کر کہا — لیکن جونہی وہ ان کے ساتھ ایک گھڑا اٹھانے لگے، انسپکٹر جمشید بول اٹھے:

"ارے ارے — آپ تو واقعی یہ کام کرنے لگے۔"

"تو پھر؟"

"رہنے دیں — آپ کے حصے کا کام ہم کر لیں گے۔"

"یہ بھی تو غلط بات ہو گی۔"

"نہیں — غلط ولط کچھ نہیں ہو گا — بس آپ ایک طرف بیٹھ جائیں۔"

"اچھا — لیکن یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"کوئی بات نہیں — آپ بیٹھ جائیں۔"

وہ گھڑے بھرنے لگے — ایسے میں ایک نمبردار ادھر سے گزرا — اس نے چیخ کر کہا:

"اے بوڑھے — تو کیوں بیٹھا ہے — چل پانی بھر۔"

پروفیسر داؤد گھبرا گئے اور لگے اٹھنے —

"نہیں نہیں — آپ بیٹھے رہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اس نمبردار کی طرف مڑے:

"یہ بوڑھے ہیں — ان کے حصے کا پانی ہم بھر لیں گے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا — اسے بھی کام کرنا پڑے گا۔"

"آپ نے ہماری ڈیوٹی یہی لگائی ہے نا کہ تمام کوٹھریوں کے گھڑے بھر دیں۔"

"ہاں — بالکل۔"

"بس تو پھر آپ کو تمام گھڑے بھرے ہوئے مل جائیں گے۔" وہ بولے۔

"لیکن اسے بھی کام کرنا ہوگا — یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کام نہ کرے۔"

"تو ان کے ذمے کوئی نرم کام لگا دیں — یہ کمزور ہیں — بوڑھے ہیں — اتنا وزن نہیں اٹھا سکتے۔"

"نہیں — اسے پانی ہی بھرنا ہوگا۔"

"دیکھیے — میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ بوڑھے ہیں، کمزور ہیں — خدا کا خوف کریں — اور پھر ان کے حصے کا سارا کام ہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"ناممکن — اسے اپنے حصے کا کام کرنا ہوگا — اور یہی کام کرنا ہوگا — ورنہ سزا ملے گی۔"

"رہنے دو جم...۔" وہ ان کا نام لیتے لیتے رہ گئے، پھر جلدی سے بولے:

"میں گھڑے بھر دوں گا۔"



"نہیں نہیں — یہ آپ کا کام نہیں ہے — ہم آپ کو نہیں بھرنے دیں گے۔"

"اے مسٹر — آپ لوگ اپنے گھر میں نہیں جیل میں ہیں — یہاں آپ کی مرضی نہیں — جیل کا قانون چلے گا — تم لوگ منشیات کے مجرم ہو — تم لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی نرمی نہیں برتی جائے گی۔"

"ایک ہیرا لے لو — اور انہیں پانی بھرنے پر مجبور نہ کرو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ہیرا — ہیرا تمہارے پاس کہاں سے آیا — تم لوگوں کے پاس جو کچھ تھا — وہ تو جیلر صاحب کے پاس امانت رکھا ہے۔"

"تم اس بات کو چھوڑو — ہیرا لینے کے لیے تیار ہو تو بتاؤ۔"

"اچھا نکالو — لیکن اس بوڑھے کے حصے کا کام تم لوگوں کو کرنا ہوگا۔"

"وہ ہم کر رہے ہیں — تم فکر نہ کرو۔"

"اچھا نکالو ہیرا۔"

"یہ ہوئی نا بات — اچھا — اس جیل سے نکلنے کی کوئی صورت ہے — ہم تمہارا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔"

"وہ بعد کی بات ہے — ابھی تم لوگ نئے نئے آئے ہو۔"

"لیکن دیر ہونے کی صورت میں تم لوگ نقصان میں رہو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہماری تمام دولت پر کوئی اور قبضہ کر لے گا اور پھر اس میں سے آپ کو ہم کچھ نہیں دے سکیں گے۔"

"یہ کیا بات ہوئی — کوئی کس طرح قبضہ کر لے گا۔"

"تم نہیں رہا کرا سکتے تو چھوڑو — یہ ہیرا لو اور چلتے بنو۔ یہ پانی نہیں بھریں گے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

"اے — تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو — جانتے نہیں، یہ جیل ہے۔"

"ہاں! جانتے ہیں — یہ جیل ہے — جو کہا ہے — درست کہا ہے۔"

"تمہارے کس بل نکالنے پڑیں گے۔"

"ایسا نہ ہو — اپنے کس بل نکلوا لو۔"

"کیا کہا۔" وہ چلا اٹھا۔

آس پاس کے قیدی اس طرف متوجہ ہو گئے — کچھ نمبردار وغیرہ بھی اس طرف بڑھنے لگے — ایک نمبردار نے چیخ کر کہا:



"کیا بات ہے بانے؟"

"بات کیا ہوتی — یہ لوگ نئے نئے ہیں نا — کچھ زیادہ ہی اکڑ رہے ہیں۔"

"ابھی ان کی اکڑ نکال دیں گے۔"

"اچھا تو پھر تم دو ہیرے لے لو — اور ہمارا پیچھا چھوڑو۔"

"نہیں — اب پہلے تمہاری مرمت کریں گے — پھر اس بوڑھے سے پانی بھروائیں گے — اس کے بعد تم سے دو ہیرے کیا — جتنے تم نے چھپا رکھے ہیں، سب وصول کریں گے۔"

"ارے باپ رے — مارے گئے پھر تو۔"

"ابھی کیا ہے — ابھی تو آگے آگے مارے جاؤ گے تم لوگ۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔"

ان کے گرد تین نمبردار جمع ہو گئے — پھر تینوں ایک ساتھ انسپکٹر جمشید پر حملہ آور ہوتے، لیکن اچھل اچھل کر دور جا گرے:

"کک — کیا ہوا بھائی — تم لوگ اتنی دور کیوں چلے گئے، ابھی تو مقابلے کی بات کر رہے تھے۔"

ان کے چہروں پر حیرت ہی حیرت نظر آئی — دوسرے

قیدیوں کے تو منہ کھلے کے کھلے رہ گئے — یہاں کی قید کے
دوران شاید ان کے لیے یہ منظر عجیب ترین تھا —

تینوں نمبردار اٹھے اور اس مرتبہ انھوں نے اپنی پنڈلیوں
سے خنجر نکال لیے —

قیدیوں کے چہروں پر خوف دوڑنے لگا —

"نہ نہ بھئی — یہ غلط ہے — فاؤل ہے — ہاتھوں سے
لڑو" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

"اور کیا — کہیں خنجر لگ گئے تو" خان رحمان بولے۔

"لیکن انھوں نے جیسے کوئی بات نہیں سنی — خنجر تولتے
ہوئے ان کی طرف جھپٹے — لیکن جلد ہی قیدیوں نے دیکھا
کہ وہ دور کھڑے تھے — اور نمبردار آپس میں گڈمڈ ہو
گئے تھے اور اس گڈمڈ ہونے میں ان میں سے دو کے خنجر
لگ گئے تھے — ان کی چیخوں نے جیل کی فضا کو تھرا دیا —

"دیکھا — میں نے کہا تھا نا — کہیں خنجر لگ گئے تو"
خان رحمان ہنسے۔

"پہلے تمھیں بتاتا ہوں" وہ نمبردار بول اٹھا — جو خنجر لگنے
سے محفوظ رہا تھا اور بے تحاشہ اس کی طرف بڑھا — جونہی
اس نے وار کیا — خنجر والا ہاتھ کمر کی طرف مڑتا چلا گیا —
ساتھ ہی خان رحمان کی ٹھوکر اس کی کمر پر لگی — وہ اوندھے



منہ گرا — خنجر دور جا کر گرا —

خان رحمان نے اس کا خنجر اٹھا لیا —

"ایک بار پھر کوشش کرو" وہ بولے —

اس نے سر گھما کر ان کے ہاتھ میں خنجر دیکھا اور
آنکھیں بند کر لیں —

جلد ہی دس کے قریب نمبردار وہاں پہنچ گئے — ان
کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں:

"خبردار — ہاتھ اوپر اٹھا دو — ورنہ چھلنی کر دیں گے"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہاتھ
اوپر اٹھا دیے — اب اگر وہ لڑائی جاری رکھتے تو دوسرے
قیدی زخمی ہو سکتے تھے —

انھیں جکڑ لیا گیا، پھر جیلر کے سامنے پیش کیا گیا:

"ہاں! کیا تکلیف ہے تمھیں؟"

انسپکٹر جمشید نے ساری بات بتا دی — ہیرے کا ذکر
بھی کر دیا — جیلر نے نمبرداروں کو گھور کر دیکھا اور بولا:

"جب یہ کہہ رہے تھے کہ اپنے ساتھی کے حصے کا
پانی بھر دیں گے تو اس میں ضد کرنے کی کیا ضرورت
تھی — خیر — ختم کرو — انھیں کوٹھری میں بند کر دو —
اور انھیں باہر نہ نکالا کرو — یہ خطرناک قیدی لگتے ہیں"

"کیا اس جیل سے نجات کی کوئی صورت نہیں جناب؟"

"کیا مطلب؟" جیلر نے انھیں گھورا۔

"اگر ہمیں یہاں سے نکال دیا جائے تو ہم آپ لوگوں کے منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔"

"اتنے موتی ہیں تمھارے پاس؟"

"اتنے سے بھی زیادہ۔"

"اور وہ موتی کہاں ہیں؟"

"وہ — آپ لوگ ان موتیوں کو اس طرح حاصل نہیں کر سکتے — ہمیں باہر نکالنے کی صورت میں ہی حاصل کر سکتے ہیں۔"

"آخر کیسے؟" جیلر بولا۔

"اس لیے کہ وہ بنک کے لاکر میں رکھے ہیں — اور لاکر میں سے نکالنے کے لیے صرف مجھے جانا ہوگا۔"

"ہوں — خیر — ہم سوچیں گے — غور کریں گے — شاید کوئی صورت بن جائے — ویسے صرف موتیوں سے کام نہیں چلے گا — ہیرے کہاں جائیں گے؟" اس نے کہا۔

"ہیرے بھی آپ لوگوں کو دے دیتے ہیں، ہم یہاں سے جاتے وقت ان کا ذکر نہیں کریں گے۔" خان رحمان نے کہا۔



"میں ان ہیروں کی بات نہیں کر رہا — کیونکہ تمھارے پاس صرف وہی ہیرے تو ہوں گے نہیں — اور بے شمار ہیرے ہوں گے۔"

"اوہ" ان کے منہ سے نکلا۔

"کیوں — ہیرے ہیں یا نہیں؟"

"بالکل ہیں۔"

"تب تم تمام ہیرے اور تمام موتی یہاں لانے کی ترکیب پر غور کرو — ہم تمھیں یہاں سے نکالنے پر غور کرتے ہیں۔"

"اچھی بات ہے — ہم غور کر چکے ہیں — جب تم غور کر چکو تو بتا دینا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب — غور کر چکے ہو؟" اس نے چونک کر کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ اس میں غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں — ہمارے اس ساتھی کو آپ یہاں سے اپنے گھر اور بنک تک جانے دیں — بس یہ ہیرے اور موتی لے آئیں گے۔"

"اور — اور ساتھ میں ہمیں بھی پھنسوا دیں گے۔"

"کیا مطلب — کیسے پھنسوا دیں گے؟"

"گھر کے لوگوں کی تو خیر کوئی بات نہیں — یہ بنک منیجر

کو کیا بتائیں گے — آخر اس وقت تک تم لوگوں کی گمشدگی کی خبریں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔"

"بس تو پھر — اس کا حل صرف اور صرف ایک ہے۔"

"چلو پھر وہ حل بتا دیں — جو ہے ہی صرف اور صرف ایک۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ہم تم لوگوں کو جیل سے نکال دیتے ہیں — تم لوگوں کی جگہ ہمیں دوسرے لوگوں کو قید میں رکھنا پڑے گا — انھیں بھی لمبی چوڑی رقم دینا پڑے گی، کیونکہ اس طرح کون جیل میں رہنا پسند کرتا ہے — تم لوگ باہر جا کر اپنی تمام دولت ہمیں لا دو — خود کو بالکل خالی کر لو — کنگال بنا لو — بس اس شرط پر تم لوگ یہاں سے نکل سکو گے — ورنہ نہیں۔"

"ہمیں — ہمیں یہ شرط منظور ہے۔"

"لیکن ایک بات کا خیال رہے — اگر تم لوگوں نے وعدہ خلافی کی تو ہم تمھیں پھر پکڑ کر جیل میں ڈال دیں گے اور پھر تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے — باہر نہیں نکل سکو گے — یہاں تک کر سزا پوری ہونے پر بھی نہیں نکل سکو گے۔"



"لیکن کیوں — سزا پوری ہونے پر کیوں نہیں نکل سکیں گے — یہ کیا بات ہوئی۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"اس لیے کہ مختلف الزامات لگا لگا کر ہم تمھاری سزا میں کئی گنا اضافہ کروا دیں گے۔"

"اوہ — تو یہ بات ہے۔"

"ہاں! یہی بات ہے۔" جیلر فوراً بولا۔

"اچھا! ہمیں غور کرنے دیں۔"

"ضرور غور کرو — خوب غور کرو — غور کرنے کی بے شک انتہا کر دو — ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے — لیکن اب تم لوگوں کو اس کوٹھری سے نہیں نکالا جائے گا — اس لیے کہ تم نے جھگڑا کیا ہے۔"

"جھگڑا ہم نے نہیں — نمبرداروں نے کیا ہے۔"

"کیا ہو گا، لیکن ہمارے نزدیک مجرم تم ہو — ہم نہیں۔" یہ کہہ کر جیلر چلا گیا — نمبردار بھی انھیں کوٹھری میں بند کر کے چلے گئے — ان کے جانے کے بعد وہ سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے:

"میرا خیال ہے — اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے، ہم نے ان کا پروگرام ٹیپ کر لیا ہے — ان کی آوازیں ریکارڈ ہو گئی ہیں۔"

"لیکن جیل میک اپ میں ہے۔"

صرف ایک جیلر کا مسئلہ باقی ہے — وہ ہم حل کر لیں گے۔"

"تب پھر آج رات ہی عمل شروع..."

جب رات ہو گئی — سب قیدی سو گئے — صرف چند ایک نمبرداروں کے گشت لگانے کی آوازیں باقی رہ گئیں تو انسپکٹر جمشید نے محمود کے کان میں کہا:

"محمود! چاقو نکالو۔"

محمود نے چاقو نکالنے کے لیے ایڑی سرکائی اور پھر اس کا ہاتھ وہیں رک گیا —



# ہاتھ کا کباڑا

"کیا ہوا بھئی — سانپ تو نہیں سونگھ گیا۔" فاروق نے اسے ساکت دیکھ کر کہا — کوٹھری میں زیرو کا بلب جل رہا تھا —

"وہ — وہ — چاقو۔" محمود ہکلایا۔

"وہ — وہ — چاقو — یہ کیا بات ہوئی بھلا۔"

"چاقو میں ایڑی نہیں ہے۔"

"تو ہم کب کہہ رہے ہیں کہ چاقو میں ایڑی ہے — تم ایڑی میں چاقو تلاش کرو نا۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے — ایڑی میں چاقو نہیں ہے۔"

"اوہ! اس صورت میں تم ضرور چاقو میں ایڑی تلاش کرو۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"مروا دیا بھئی تم نے تو — اب — اب کیا ہو گا؟"

"وہی ہو گا — جو منظورِ خدا ہو گا۔" پروفیسر داؤد بڑبڑائے۔

"ٹھہرو — میں ان سلاخوں پر زور لگا کر دیکھتا ہوں۔"
"لیکن ابا جان! یہ تو بہت موٹی ہیں۔" محمود بولا۔
"جی ہاں! اور آپ انھیں پتلا کر نہیں سکیں گے۔" فاروق
نے فوراً کہا۔
انسپکٹر جمشید نے انھیں گھورا اور پھر سلاخوں کی طرف
بڑھے — دو سلاخوں کو پکڑ کر انھوں نے زور لگانا شروع
کیا — لیکن سلاخیں اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوئیں۔
"نہیں — یہ نہیں مڑیں گی — محمود — یہ کیسے ہوگیا —
تم ایڑی میں چاقو رکھنا کس طرح بھول گئے؟"
"جوتا بدلا تھا — اور بس دوسرے جوتے سے چاقو اس
جوتے میں منتقل کرنا بھول گیا۔"
"چلو شکر کرو — صرف چاقو رکھنا بھولے ہو — جوتا
پہننا نہیں بھولے — اگر تم ننگے پاؤں آ جاتے تو ہمارا
کیا بنتا — پھر تو چاقو جوتے کی ایڑی سے نکلنے کا سوال
ہی نہ پیدا ہوتا۔"
"اور اب سوال پیدا کر کے کیا کریں گے ہم۔" فرزانہ نے
جھلا کر کہا۔
"اے — یہ تم کیا کھسر پھسر کر رہے ہو — سو جاؤ،
ورنہ صبح کام کرتے وقت اونگھو گے۔" ایک نمبردار نے پاس



سے گزرتے ہوئے کہا۔
"ہمیں صبح کوئی کام نہیں کرنا ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"وہ کیسے؟"
"جیلر صاحب ہم پر بہت مہربان ہیں — انھوں نے حکم
دیا ہے کہ ہم سے کوئی کام نہ لیا جائے۔"
"میں سمجھ گیا — تم لوگوں کو صبح کوٹھری سے نہیں نکالا
جائے گا — تم نے باہر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی
ہو گی — یہ تو تمھیں سزا ملی ہے — سزا — کوٹھری سے
باہر رہ کر اگرچہ قیدیوں کو کام کرنا پڑتا ہے، لیکن وہ
کھلی فضا میں نکل کر خوش ہوتے ہیں۔"
"اب کیا بتائیں — ہو گئی ہم سے گڑبڑ۔"
"کوئی بات نہیں — آئندہ نہ کرنا — تین چار دن بعد جیلر
صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ تم لوگوں کو بھی
باہر نکالنے کا حکم دے دیں گے۔"
"یہ دیکھیں — ہمارے پاس کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے
خفیہ جیب سے چند ہیرے نکال کر ہتھیلی پر رکھ کر
اسے دکھائے —
"یہ — یہ کیا ہیں؟"
"ہیرے — اس قدر قیمتی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

پچاس لاکھ روپے کا صرف ایک ہیرا ہے ۔ اور یہ تو دس ہیں۔"

"ارے باپ رے ۔۔ لیکن یہ تمہارے پاس کس طرح رہ گئے ۔۔ جیل میں آنے والوں کی پہلے اچھی طرح تلاشی لی جاتی ہے۔"

"تلاشی لے کر تو یہ ہیرے تم بھی میرے پاس سے برآمد نہیں کر سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور تم نے ہیرے مجھے کیوں دکھائے؟"

"تم چاہو ۔۔ تو یہ ہیرے تمہارے ہو سکتے ہیں۔"

"وہ ۔۔ وہ کیسے؟"

"ہمیں جیل سے باہر نکال دو۔"

"اس کا کیا فائدہ ہوگا ۔۔ تم لوگوں کو پھر پکڑ لیا جائے گا اور ساتھ میں میری بھی شامت آئے گی۔"

"ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ لے چلیں گے۔"

"کیا مطلب ۔۔ ساتھ لے چلیں گے۔"

"ہاں ! اور کیا ۔۔ ہیرے پا کر تو تم کروڑپتی ہو جاؤ گے ۔۔ یہ ملازمت کرنے کی کیا ضرورت رہ جائے گی۔"

"لیکن پولیس میرے پیچھے پڑی رہے گی۔"

"نہیں پڑی رہے گی ۔۔ تمہیں یہاں سے دو دراز کے



ایک شہر میں بھیج دیں گے۔"

"اور میرے بیوی بچے۔"

"انہیں بھی ساتھ لے جانا ، روکا کس نے ہے۔"

عین اس وقت قدموں کی آواز ابھری ۔ اور نمبردار تھرتھر کانپنے لگا ، کیونکہ جیلر سیدھا اس طرف چلا آ رہا تھا :

"ارے باپ رے ۔ اب تو میں کھسک بھی نہیں سکتا۔"

"کھسکنے کی ضرورت بھی نہیں ہے ۔۔ بھئی ہم نے تمہیں روک لیا تھا ۔۔ تم نہیں رکے تھے ہمارے پاس۔" وہ مسکرائے۔

"ارے تو ان ہیروں کو تو اندر رکھ لیں۔"

"کوئی بات نہیں ۔۔ ہم ذرا جیلر کے منہ میں پانی دیکھ لیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اتنے میں جیلر نزدیک آ گیا :

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ان لوگوں نے روکا تھا سر۔"

"رکے کیوں تھے ۔۔ رات کے وقت کسی قیدی کی کوئی بات سننے کی اجازت ہے یہاں؟" وہ غرایا۔

"نہیں سر ۔۔ نہیں ہے۔"

"پھر تم کیوں رکے ۔۔ کیا نمبر ہے تمہارا؟"

"جی بارہ۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو نمبر بارہ — اب گشت پر جاؤ — صبح تم سے نبٹ لوں گا — اگر سارے قیدیوں تک تمھاری چیخیں نہ پہنچیں تو میرا نام بارود نہیں۔"

"لیکن آپ کا پورا نام تو ابرار بارود ہے۔" فاروق نے گویا یاد دلایا۔

"تم چپ رہو جی۔" وہ غرایا۔

"ج — جی بہتر۔" اس نے کانپ کر کہا۔

نمبردار نے وہاں سے دوڑ لگا دی — اب جیلر ان کی طرف مڑا اور پھر زور سے چونکا:

"ارے یہ کیا؟" اس کی نظریں ہتھیلی پر جمی تھیں۔

"یہ ہیرے ہیں مسٹر جیلر — آپ کے نمبردار کو دکھا رہے تھے۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن کیوں؟"

"اس جیل سے باہر نکالنے کا معاوضہ اسے دکھایا تھا ہم نے۔" وہ بولے۔

"لیکن! یہ ہیرے تمھارے پاس آئے کہاں سے؟"

"اپنے تلاشی لینے والوں سے پوچھیں۔"

"وہ تو میں صبح پوچھوں گا — تم اپنی بات کرو۔"



"بس یہ ہیرے ہیں — قریباً چار کروڑ کے ہیں — آپ لے لیں اور ہمیں یہاں سے باہر نکل جانے دیں۔"

"اب اتنے سستے بھی نہیں چھوٹ سکتے تم — اور ان ہیروں کا کیا ہے — یہ تو میں تم سے ابھی لے لیتا ہوں، لاؤ ہیرے مجھے دے دو۔" اس نے بے تابانہ انداز میں کہا۔

"کیا کریں گے ان کا — آپ کے لیے بے کار ہیں۔" خان رحمان ہنسے۔

"اور تم کوٹھری میں رہ کر ان کا اچار ڈالو گے کیا۔" جیلر نے جل کر کہا۔

"کیا کہا — ہیروں کا اچار — بھئی واہ۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"کیوں — کیا ہوا — کیا یہ کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔" محمود نے اسے گھورا۔

"کیا مطلب؟" جیلر زور سے اچھلا — اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"کیا بات ہے، آپ کس بات پر حیران پریشان اور خوفزدہ ہیں؟" فاروق نے فوراً کہا۔

"کک — کچھ نہیں — ایک بات یاد آ گئی — میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے کہا اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا۔

"ناول کا نام ہو سکتا ہے — یہ جملہ سُن کر یہ حضرت زور سے چونکے تھے ۔ اس کا مطلب ہے — یہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں — ہمارے کارناموں کی کہانیاں جو لوگ چھاپتے رہتے ہیں ، یہ ان کو بھی غور سے پڑھتے ہیں — لہٰذا فاروق کے اس جملے کے بارے میں انھیں معلوم ہو گا — اب تم دیکھ لینا — یہ حضرت نہیں آئیں گے۔"

"نہیں آتے — نہ آئیں — ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔"

"لیکن ہم اپنا کام کس طرح کریں — محمود کے چاقو کی غیر حاضری نے کام خراب کر دیا ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"اب ہمیں جلد از جلد کچھ نہ کچھ کر ڈالنا چاہیے ، ورنہ کہیں ہم اس کوٹھری میں ہی نہ رہ جائیں۔"

اچانک انھوں نے مل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ کئی نمبردار دوڑ کر ان تک آئے :

"کیا بات ہے — کیوں شور مچا رہے ہو؟" وہ سلاخوں سے آ لگے — کیونکہ وہ بُری طرح لوٹ پوٹ ہو رہے تھے — اسی طرح لوٹ پوٹ ہوتے ہوتے — اچانک انسپکٹر جمشید کا ہاتھ سلاخوں سے باہر نکلا اور انھوں نے



ایک نمبردار کی ایک ٹانگ پکڑ لی ۔

"ارے ارے — یہ کیا؟"

"جلدی سے کوٹھری کا دروازہ کھول دو — ورنہ ٹانگ کا سُرمہ بن جائے گا۔"

"ٹانگ کا سُرمہ" فاروق نے مارے حیرت کے کہا۔

"ہاں بھئی — آنکھوں کی کمزوری میں بہت کام کی چیز ہے۔" محمود مسکرایا۔

"ہمارے پاس چابی نہیں ہے۔"

"تو اپنے انسپکٹر کو بلاؤ — ورنہ تمہاری ٹانگ نہیں چھوٹے گی۔"

"ارے میری جان نکلی جا رہی ہے — یہ — یہ اس شخص میں آخر کتنی طاقت ہے — اس زور سے بھینچ رہا ہے — گویا میری ٹانگ کا قیمہ بن جائے گا۔"

"چلو اچھا ہے — پکانے کے کام آئے گا۔" فاروق نے کہا۔

باہر موجود دوسرے نمبرداروں نے اور خود اس نے ٹانگ چھڑانے کی کوشش شروع کر دی — وہ زور لگا لگا کر تھک گئے — مگر ٹانگ نہ چھوٹی ۔

"اس کے ہاتھ پر کوئی چیز مارو۔" ایک نمبردار نے

جھلا کر کہا۔

"ارے ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

"کیا خاک ٹھیک رہے گا۔ اگر وہ چیز میری ٹانگ پر لگ گئی تو میری تو نکل جائے گی جان۔" اس نمبردار نے کہا جس کی ٹانگ قابو میں تھی۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا، تم فکر نہ کرو شیدے۔"

فوراً ہی ایک لکڑی لائی گئی۔ ایک نمبردار نے اس کو ایک سرے پر سے پکڑ لیا۔ اور لگا انسپکٹر جمشید کے ہاتھ کا نشانہ لینے۔

"دیکھو بھئی۔ ذرا سوچ سمجھ کر نشانہ لینا۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔" ایسے میں محمود نے چہک کر کہا۔

"خاموش رہو۔ ابھی اس کے ہاتھ کا کباڑا ہو جائے گا۔"

"ہمیں بھی دکھا دینا۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"کیا چیز؟" پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔

"کباڑا۔ اور کیا؟"

"حد ہو گئی۔ تم بھی کیا کچھ دیکھتے رہتے ہو۔"

"کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔"

ادھر لکڑی والا ہاتھ بلند ہو چکا تھا۔ وہ شخص پوری طرح



ان کے ہاتھ کا نشانہ لے چکا تھا۔ ان کے دل بھی دھک دھک کرنے لگے۔ اچانک لکڑی والا ہاتھ پورے زور سے نیچے آیا۔

اور پھر ایک تیز ترین چیخ جیل کی فضا میں گونجی۔

# پھول

اور یہ چیخ تھی اسی نمبردار کی جس کی ٹانگ پکڑی ہوئی تھی، انسپکٹر جمشید نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ جونہی لکڑی نیچے آئی تھی — اپنا ہاتھ ہٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی دوسری ٹانگ پکڑ لی تھی — لہٰذا صاف ظاہر ہے — لکڑی اس کی ٹانگ پر لگی تھی — وہ چیخ نہ اٹھتا تو کیا کرتا۔

"ارے باپ رے — بیڑا غرق کر دیا نا — میں تو پہلے ہی کہ رہا تھا۔" نمبردار نے کراہتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں — ہم کہ رہے تھے۔" محمود نے گویا یاد دلایا۔

"اور اب — اب اس نے دوسری ٹانگ پکڑ لی ہے۔"

"ہم بھی بے وقوف ہیں — اس کے سر پر ڈنڈا کیوں نہیں مارتے — سر پھٹے گا تو ٹانگ خود بخود چھوڑ دے گا۔"

"یہ کوشش اور بھی زیادہ نقصان دہ ہو گی۔" انسپکٹر جمشید ہنس دیے۔



"اب یہ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے — ٹونی — اس کے سر پر ڈنڈا پورے زور سے مارو — ڈنڈا نہیں لگے گا تو بھی ہمارا کیا نقصان ہو گا — جیسے کہ پہلے ہم نقصان اٹھا چکے ہیں۔" زخمی نمبردار نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔"

اب اس نے ان کے سر کا نشانہ لیا — لیکن درمیان میں سلاخیں تھیں اور اس حالت میں نشانے پر مارنا آسان کام نہیں تھا — تاہم وہ یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو گیا — ادھر انسپکٹر جمشید اور خان رحمان کی نظریں ٹکرائیں — اور انھوں نے خان رحمان کو اشارہ کیا —

جونہی لکڑی والا ہاتھ اندر آیا، انھوں نے اپنا سر ایک طرف جھکا لیا — دوسری طرف سے خان رحمان نے اس ہاتھ کو کلائی سے پکڑ لیا — اور ڈنڈا محمود نے اُچک لیا —

"اب ذرا اس بازو پر یہ ڈنڈا رسید کرو — دیکھنا اسے کتنا مزا آئے گا — لیکن ڈنڈا ذرا آہستہ مارنا — کہیں بازو ٹوٹ ہی نہ جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے نمبردار کے بازو پر ایک ڈنڈا درمیانہ سا رسید کر دیا — اس کے منہ سے چیخ نکل گئی — اب دو نمبردار

ان کے قابو میں آ چکے تھے۔

" اب اس کوٹھری کا دروازہ کھلواؤ۔ ورنہ ان دونوں کی جان نہیں چھوٹے گی۔"

" خیرے۔ تم ذرا جا کر انسپکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔ ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔" پہلے نمبردار نے کہا۔

اور خیرے نے دوڑ لگا دی۔ جلد ہی انسپکٹر دوڑتا ہوا ان کی طرف آیا:

" یہ کیا ہو رہا ہے؟"

" اس کوٹھری کا دروازہ کھولو۔ نہیں تو ہم انھیں بری طرح ماریں گے۔"

" دماغ تو نہیں چل گیا۔" انسپکٹر غرایا۔

" کیوں جناب، اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

" مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تالا کھولوں۔ میں پستول کے ذریعے تم دونوں کو شوٹ کر سکتا ہوں یا کم از کم زخمی کر سکتا ہوں۔ اس صورت میں تم ان کی ٹانگ اور بازو چھوڑ دو گے۔" اس نے جلدی جلدی کہا۔

" ضرور۔ یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ کوئی حسرت نہ رہ جائے، لیکن ایک بات سن لو۔ گولی اگر تمھارے اپنے نمبردار کے



لگ گئی تو ہمیں الزام نہ دیجیے گا۔ اور اس بات کو لکھ لو۔ ہو گا یہی۔"

" ایسا نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ میں بہت نزدیک سے گولی چلاؤں گا۔"

" اپنا شوق پورا کر لو۔ تم دونوں میں سے کم از کم ایک دوسرے جہان جانے کے لیے تیار ہو جائے۔"

" نن۔ نہیں۔" دونوں مارے خوف کے چلائے۔

" تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا بے وقوفو۔ گولی تمھیں کس طرح لگے گی۔ جب کہ میں نشانہ ان کا لوں گا۔"

" لیکن جناب پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ ٹونی نے نشانہ ان کا لیا تھا اور خود اپنا ہاتھ پھنسوا بیٹھا۔"

" یہ اناڑی تھا۔ اور تم بھی جو اپنی ٹانگ پھنسوا بیٹھے، اب دیکھنا، میں کس آسانی سے تم دونوں کو چھڑاتا ہوں۔"

یہ کہ کر اس نے پستول نکال لیا۔ اور انسپکٹر جمشید کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے بولا:

" ابھی بھی وقت ہے۔ ان دونوں کو چھوڑ دو۔ ورنہ گولی سر کے پار ہو گی۔"

" چلو اچھا ہے۔ آنکھیں تو بچ جائیں گی۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"شاید یہ لڑکا پاگل ہے — ہر وقت اوٹ پٹانگ باتیں
کرتا رہتا ہے۔"

"آپ اس کی باتوں پر نہ جائیں، اپنا کام کریں۔"

انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"میں تمھارے سر پر گولی چلا رہا ہوں — اور اس سے
پہلے وارننگ دیتا ہوں — ان دونوں کو چھوڑ دیا جائے —
اس صورت ہم کوئی انتقامی کارروائی نہیں کریں گے۔"

"نہیں — ہم انھیں صرف اس صورت میں چھوڑیں گے،
اگر تم کوٹھری کا دروازہ کھول دو۔"

"دروازہ نہیں کھلے گا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں کھلے گا تو ہم بھی ان کے ہاتھ پیر نہیں چھوڑیں گے۔"

"کوئی پروا نہیں — تم ان کے ہاتھ پیر نہ چھوڑو —
ہمیں اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"ان کی عذاب میں جان اٹکی رہے گی۔"

"تو اٹکی رہے — ہم ایسے دو ملازم اور رکھ لیں گے۔"

"تم نے سنا — یہ حضرت کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟"

"ہاں! اب ہم تم دونوں کی خاطر انھیں کوٹھری سے
تو نکالنے سے رہے — پتا بھی ہے — ابھی ابھی جیلر صاحب



یہاں سے رخصت ہوئے ہیں اور رخصت ہوتے ہوئے
انھوں نے کیا بتایا ہے۔"

"کک — کیا بتایا ہے؟"

"یہ کہ یہ حضرت انتہائی خطرناک ہیں — اس قدر خطرناک
کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"آخر کیوں نہیں سوچ سکتے؟"

"اس لیے کہ ان کے نام انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور
فرزانہ ہیں اور ان کے ساتھی بھی عام لوگ نہیں ہیں — پروفیسر
داؤد اور خان رحمان ہیں۔"

"کیا!!" وہ سب پوری قوت سے چلائے۔

ان کے چہروں پر موت کا خوف چھا گیا — آنکھوں میں
بھی بے پناہ خوف نظر آیا — اور پھر وہاں سے انسپکٹر اور
اس کے ساتھی اس طرح غائب ہو گئے، جیسے گدھے کے
سر سے سینگ — اور کوٹھری کی سلاخوں سے صرف وہ
دونوں لگے رہ گئے —

"اب اگر ہم چاہیں تو تمھیں ختم کر سکتے ہیں — یہ تم
نے دیکھ ہی لیا ہے کہ تمھارے ساتھی تم دونوں کو موت
کے منہ میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے — ہمیں اپنی اوقات کا پتا چل گیا ہے۔"

"چلو شکر ہے — تو اب ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں — تم ہمارے لیے کوٹھری نہیں کھولتے، نہ کھولو۔"

"ہمیں افسوس ہے — ہمارے پاس چابی واقعی نہیں ہوتی۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ارے کوئی ہتھوڑا وغیرہ تو لا کر دے سکتے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا۔

"اوہ ہاں! اس قسم کی کوئی چیز ہم لا کر دے سکتے ہیں، لیکن آپ لوگ اگر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہمیں بھی ساتھ لے جائیے گا — بے شک ہمیں جیل بھجوا دیجیے گا — ورنہ یہاں کا جیلر تو ہمیں زندہ دفن کرا دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" انھوں نے کہا۔

دونوں نے دوڑ لگا دی — پندرہ منٹ بعد وہ ایک بڑا ہتھوڑا اور چند دوسرے اوزار لے آئے:

"کیا خیال ہے — ان سے کام چل جائے گا؟"

"ہاں! زبردست امید ہے۔" انھوں نے کہا اور ان کی مدد سے تالا کھولنے کی کوشش شروع کر دی — وہاں اب کوئی نمبردار نہیں تھا —

"یہ دوسرے نمبردار نظر نہیں آ رہے۔"



"اس بات پر تو ہم دونوں بھی حیران ہیں۔"

"اور جیلر صاحب تو پہلے ہی غائب ہو چکے ہیں۔"

"خیر — دیکھتے ہیں — پہلا مسئلہ تو کوٹھری سے نکلنے کا ہے۔"

"اگر تالا نہیں ٹوٹتا تو اس ہتھوڑے سے دیوار میں نقب تو لگائی ہی جا سکتی ہے۔" فاروق نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں! یہ بھی کریں گے — اگر تالا نہ ٹوٹا — فکر نہ کرو۔"

"ہم کوئی اور چیز تلاش کرتے ہیں۔" ایک نمبردار بولا۔

"لیکن تم فرار نہ ہو جانا — فرار نہ ہونا تمھارے حق میں مفید رہے گا — ہم تم دونوں کی پوری مدد کریں گے۔"

"نہیں فرار ہوں گے۔" ٹونی نے کہا۔

وہ کوشش میں لگے رہے — تھوڑی دیر بعد دونوں نمبردار آئے تو ان کے ہاتھوں میں دو عدد پھاوڑے تھے —

"بھئی واہ — بن گیا کام — ان کی مدد سے دیوار توڑنا آسان ہو گیا ہے۔"

اب انھوں نے تالے کو چھوڑ کر دیوار توڑنے کی کوشش شروع کی — آخر دیوار میں سوراخ بننے لگے اور وہ باہر نکلنے کے قابل ہوئے —

"خدا کا شکر ہے — ہم تو سچ مچ خود کو جیل میں محسوس کرنے لگے تھے۔" فاروق نے جلدی سے کہا اور دوسرے

مسکرانے لگے۔

اس دوران آس پاس کی کوٹھریوں والے بھی اس کھیل کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے تھے۔ جو دیکھ نہیں سکتے تھے، وہ سُن رہے تھے ۔۔۔ جُونہی انھیں باہر نکلتے دیکھا گیا، اُن سب نے شور مچا دیا:

"ہمیں بھی باہر نکالیں ۔۔۔ ہمیں بھی باہر نکالیں۔"

"خاموش! آپ سب کو باہر نکالا جائے گا۔ فکر نہ کریں ۔۔۔ پہلے مجھے ایک دو فون کرنا پڑیں گے۔ تاکہ مدد آجائے ۔۔۔ اس طرح ہم جلد فارغ ہو جائیں گے ۔۔۔ ورنہ ساری رات تو دیواریں توڑنے میں گزر جائے گی اور اس دوران جیلر صاحب اپنے غنڈوں کو لے کر آ گئے تو نئی صورتِ حال ہو گی ۔۔۔ آپ لوگوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔۔۔ لہٰذا جو ہم کر رہے ہیں ۔۔۔ ہمیں کرنے دیں۔ ہم آپ کو پہلے آپ کے گھروں میں بھیجیں گے ۔۔۔ ہم بعد میں جائیں گے۔"

ان کی اس تقریر نے بہت اچھا اثر کیا ۔۔۔ اور پھر انھوں نے جیل کے دفتر کا فون دیکھا، لیکن صرف فون کا سیٹ تھا ۔۔۔ اس میں آواز وغیرہ نہیں تھی ۔۔۔ گویا صرف دکھاوا تھا ۔۔۔ کیونکہ آخر ۔۔۔ جیلر کے دفتر میں فون بھی تو ہوتا ہے ۔۔۔ آخر انھوں نے وہاں سے نکل کر کافی دور جا کر ایک زمیندار کی کوٹھی سے فون کیا ۔۔۔ اس علاقے اور آس پاس کی پوزیشن کے بارے میں بھی اس زمیندار سے پوچھ کر اکرام کو بتایا اور جیل میں آ گئے۔



"آپ لوگوں کو ایک گھنٹے تک مزید انتظار کرنا پڑے گا ۔۔۔ مدد آنے میں ایک گھنٹا لگے گا۔"

"لیکن ایک گھنٹے میں تو کئی کوٹھریوں کی دیواریں ان پھاوڑوں سے ٹوٹ سکتی ہیں۔"

"اچھی بات ہے ۔۔۔ چلو بھئی ۔۔۔ شروع ہو جاؤ۔" انھوں نے ٹونی اور شیدے سے کہا۔

وہ دونوں پھاوڑے برسانے لگے ۔۔۔ جیل میں اب نہ تو انسپکٹر تھا، نہ جیلر اور تمام نمبردار بھی غائب تھے ۔۔۔ کاغذات وغیرہ بھی وہ ساتھ لے گئے تھے ۔۔۔ اس کا مطلب تھا، ان کے نام سنتے ہی انھوں نے بھاگنے کی کی تھی ۔۔۔

"تمھارے ناول والے جملے نے کام خراب کر دیا۔" محمود نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہ کیسے ۔۔۔ اس جملے سے تو ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیسے ۔۔۔ ذرا وضاحت کرو۔"

"بھئی ہم لوگ آسانی سے کوٹھری سے نکل آئے ہیں اور اب باقی بھی نکل آنے والے ہیں — ان لوگوں کی موجودگی میں ہم اس قدر آسانی سے تو نہ نکل سکتے۔"

"اور اب ان لوگوں کی تلاش میں جو نکلنا پڑے گا۔" فرزانہ نے آنکھیں نکالیں۔

"تو کیا ہوا — اور معاملات میں ہم تلاش میں نہیں نکلتے رہتے؟" اس نے فوراً کہا۔

"ہاں! یہ بھی ہے۔"

"بھئی چھوڑو — اس میں فاروق کا بھی کیا قصور — اب اسے کیا معلوم تھا کہ یہ لوگ اس کے اس خاص جملے سے بھی واقف ہوں گے۔" خان رحمان نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں اور کیا۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"چلیے خیر — آپ کہتے ہیں تو جانے دیتے ہیں، ورنہ ہم اور اسے جانے دیں۔" محمود بولا۔

"اوہو — تم اور مجھے نہ جانے دو — ذرا روک کر دکھانا۔"

"حد ہو گئی — یعنی کہ — ہم کیوں روک کر دکھائیں — جہاں جانا چاہتے ہو — جاؤ۔" فرزانہ نے تلملا کر کہا۔

آخر اکرام پولیس کی گاڑیاں لے کر وہاں پہنچ گیا — اس وقت تک صرف دو کوٹھریوں کی دیواریں توڑی جا سکی



تھیں — اب جدید آلات کے ذریعے تالے توڑے گئے اور تمام قیدی باہر نکال لیے گئے — ان کے نام پتے نوٹ کیے گئے، پھر اکرام کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ گاڑیوں میں انھیں ان کے گھروں تک پہنچائیں — خود وہ وہاں ماہرین کے ساتھ ٹھہر گئے — اور تمام جگہوں سے انگلیوں کے نشانات اٹھائے گئے — خاص طور پر جیل کا جو دفتر بنایا گیا تھا — اس سے — کیونکہ وہاں جیلر اور انسپکٹر بیٹھتے تھے:

"اب مجرموں کی تلاش میں خاک چھانتے پھریں گے — بے کوئی تُک۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیا کیا جائے — مجبوری ہے — ہمارا کام ہی یہی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

انگلیوں کے نشانات اٹھانے کے دوران فرزانہ کی نظر ایک ایش ٹرے پر پڑی — اس میں سگریٹ کے چند ٹکڑے بجھائے گئے تھے — اس نے بے خیالی میں — ان ٹکڑوں کو سونگھا، پھر بولی:

"ان ٹکڑوں کو بھی سنبھال کر رکھ لینا چاہیے — شاید مجرم کا سراغ ان سے مل جائے۔"

"لیکن یہ کوئی خاص سگریٹ نہیں ہیں — ہزاروں آدمی ان سگریٹوں کو پیتے ہیں۔"

"لیکن ہمارے کیس سے متعلق کوئی آدمی پتا مل گیا تو ہم اسے شک کی زد میں لے کر تحقیقات تو کر سکیں گے نا" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا" وہ بولے۔

ان سگریٹوں کے ٹکڑوں کو محفوظ کر لیا گیا۔ باقی دفتر کی وہ پوری طرح صفائی کر گئے تھے۔ لیکن۔ جیلر والے کمرے کے فرش پر اور میز کے نیچے۔ آخر انھیں ایک اور کام کی چیز مل ہی گئی۔ وہ چیز جلدی میں کہیں گر کر میز کے نیچے چلی گئی تھی۔ ورنہ وہ اس کو کبھی نہ چھوڑتے۔ اور وہ چیز تھی۔ گلاب کا ایک پھول۔ مصنوعی پھول۔ جو کوٹ کے کالر میں لگایا جاتا ہے۔

انھوں نے اس پھول کو بھی محفوظ کر لیا۔

"کیا ہم نے یہ پھول کسی کے کالر میں لگا ہوا دیکھا ہے؟" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کچھ یاد نہیں آ رہا" محمود بولا۔

"اگر نہیں دیکھا تو اب دیکھ لیں گے" فاروق مسکرایا۔

"عجیب احمق ہو۔ کیسے دیکھ لیں گے۔ اب یہ مجرم کے پاس نہیں۔ ہمارے پاس ہے"

"بھئی اگر وہ کوٹ کے کالر میں پھول لگانے کا عادی



ہے۔ تو دوسرا لگائے گا"

"اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہو گی کہ یہ پھول بھی اسی کا ہے"

"کر لیں گے ہم کھینچ تان کر ثابت"

"یہی تو مشکل ہے۔ ہم لوگ کھینچ تان کر کچھ ثابت نہیں کرتے۔ جو بات ہوتی ہے۔ اسی کو ثابت کرتے ہیں"

"دیکھا جائے گا"

اور پھر وہ بھی وہاں سے رخصت ہوئے۔ اس جگہ کچھ سادہ لباس والے چھوڑ دیے گئے۔ رات کو ہی انھوں نے پریس کانفرنس بلائی اور تمام حالات رپورٹروں کو سنا دیے۔ دوسرے دن کے اخبارات میں اس جیل کی کہانی پوری تفصیلات کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ لیکن وہ ابھی پوری طرح خوش نہیں تھے۔ اگرچہ اخباری خبروں کے بعد انھیں مبارک باد کے فون پر فون آ رہے تھے۔ وہ خوش کس طرح ہوتے۔ ابھی مجرم آزاد تھے۔ لوٹی گئی دولت بھی ان کے قبضے میں تھی۔ صرف مصیبت زدہ لوگ اپنے گھروں کو پہنچے تھے۔ ویسے یہ بھی کچھ کم بات نہیں تھی۔ ان گھروں میں تو خوشیاں ہی خوشیاں پھیل گئی تھیں۔ دوسری صبح وہ گھر سے باہر نکلے ہی تھے کہ رجب میران کی طرف بڑھتا نظر آیا۔

"میں آپ لوگوں کو مبارک باد دینے آیا ہوں۔"

"ابھی اپنی مبارک باد محفوظ رکھیں — ہمارا کام مکمل نہیں ہوا، ابھی ہمیں آپ کی اور دوسروں کی دولت بھی واپس دلوانا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہو گا جب مجرم پکڑا جائے گا۔"

"خیر — آپ کی مرضی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

اور وہ آگے بڑھ گئے۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں ابا جان؟" فرزانہ بولی۔

"مجرموں کی تلاش میں۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن کہاں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"یہ تم بتاؤ۔"

"صرف میں یا یہ دونوں بھی؟"

"یہ دونوں بھی۔" انھوں نے کہا۔

"کیا بتانا ہے — ہم سُن نہیں سکے۔"

"مجرموں کی تلاش میں ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اس پر غور کرنا ہو گا — ویسے وہ جج صاحب — کیا واقعی جج لگتا تھا؟"

"نہیں — اسے تو معلوم ہی نہیں تھا — کہ — او — ے — ہم اسی عدالت کو تو بھول ہی گئے — ٹونی اور شیدا ہمیں اس عدالت تک تو لے جا ہی سکتے ہیں — ہو سکتا ہے — ہمیں وہاں



سے بھی انگلیوں کے نشانات مل جائیں — جج صاحب کے ہاتھوں میں دستانے نہیں تھے۔"

"بالکل ٹھیک — رات شاید ہم پر نیند سوار ہو گئی تھی۔"

انھوں نے فوراً گاڑی کا رخ بدلا — دفتر پہنچے — اکرام کو ان دونوں کو لانے کی ہدایت کی — جلد ہی وہ دونوں آ گئے — کافی پریشان لگ رہے تھے:

"یہ کیا جناب — ہمیں تو حوالات میں رکھا گیا ہے۔"

"فی الحال تو یہی کرنا ہو گا — عدالت میں پیش کرنے کے بعد وعدہ معاف گواہ کے طور پر تم لوگوں کو رہا کرایا جائے گا — تم فکر نہ کرو — ہاں یہ بتاؤ — حوالات میں کوئی تکلیف تو نہیں۔"

"نہیں — تکلیف کوئی نہیں۔"

"بس پھر پُر سکون رہو — بہت جلد تم دونوں اپنے گھر جا سکو گے، لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ زندگی میں تم جرائم پیشہ زندگی ہرگز نہیں گزارو گے۔"

"بالکل — آپ بے فکر رہیں — ہم اب جرم کے نزدیک تک نہیں پھٹکیں گے۔"

"شکریہ! کیا تم ہمیں جیل کی اس عدالت تک لے جا سکو گے — جہاں جج صاحب بیٹھتا رہا ہے۔"

"جی ہاں! کیوں نہیں — جیل کے پچھلی طرف ہی وہ کمرہ موجود ہے — جسے عدالت کا کمرہ بنایا گیا تھا — وہ تو یہ لوگ بند گاڑی کو یونہی اِدھر اُدھر چکر دینے کے بعد جیل میں لاتے ہیں، تاکہ قیدیوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ یہ سب کچھ مصنوعی ہے۔" ٹونی نے کہا۔

"اوہ اچھا — تو پھر چلو — ذرا اس کمرے کو بھی دیکھ آئیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

انھوں نے ماہرین کو بھی ساتھ لے لیا — اور عدالت والے کمرے میں آئے — اس کمرے سے بھی انگلیوں کے نشانات لیے گئے — پھر وہ واپس دفتر پہنچے — اکرام کو وہ نشانات دیتے ہوئے انھوں نے پوچھا:

"اب تک انگلیوں کے کچھ نشانات ریکارڈ میں سے ملے؟"

"جی ہاں! تین نشانات تو مل ہی گئے ہیں — اور یہ نشانات ہیں — راجر، ٹومی اور بوگا کے — تینوں سزا یافتہ ہیں — اور ہماری اطلاعات کے مطابق — اب یہ لوگ شریفانہ زندگیاں گزار رہے ہیں۔"

"بہت خوب! اب تو بن گیا کام — آؤ پہلے انھی کو گرفتار کیا جائے۔"

"تو کیا وہ اب بھی گھروں میں مل جائیں گے — وہ تو



اِدھر اُدھر چھپے ہوئے ہوں گے۔" اکرام نے کہا۔

"نہیں — ان لوگوں کو یہ تو معلوم نہیں کہ ہمارے پاس ان کی انگلیوں کا ریکارڈ بھی ہے۔"

"خیر — انھیں گھر دیکھ لیتے ہیں — ان کے دو ایک ٹھکانے بھی میرے علم میں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

انھوں نے پہلے ایک کے گھر کے دروازے پر دستک دی — دروازہ خود راجر نے کھولا — لیکن انھیں دیکھ کر اس کا رنگ اُڑ گیا:

"آ — آپ — لوگ یہاں کیسے؟"

"ہم نے سوچا — ذرا آج تم سے چند پیار بھری باتیں ہی کر لی جائیں۔"

"میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔" یہ کہہ کر راجر اندر جانے کے لیے مُڑا۔

"ارے ارے سنو — ایسی بھی کیا جلدی ہے — ہمیں تم سے کچھ کام ہے۔" انسپکٹر جمشید نے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔

اسے بند گاڑی میں بٹھا دیا گیا — گھر والوں کو بہت نرم لہجے میں بتا دیا گیا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے اور وہ اس کے بارے میں فکر مند نہ ہوں — وہ جلد واپس

آنے والا نہیں — ایک بار پھر جیل جانا ہو گا اسے —
گھر والوں کے رنگ اڑ گئے — پھر اس کی بیوی کی جھلائی
ہوئی آواز سنائی دی:

"بُرے کاموں کا بُرا نتیجہ — یہ بھی تو نہیں مانتا۔"

اب وہ دوسرے کے گھر پہنچے — کومی گھر نہیں ملا —
لیکن گھر والوں نے بتایا کہ ہوٹل شاہی میں ملے گا —

وہ ہوٹل شاہی پہنچے — کھانے کے ہال میں انہیں کومی
اور بوگا اکٹھے ایک میز پر مل گئے — دونوں انہیں دیکھ کر بُری
طرح اُچھلے — میز اُلٹتے اُلٹتے بچی —

"بھئی ایسی بھی کیا جلدی" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو ذرا سرکاری مہمان خانے کی سیر کرانے کے
لیے آئے ہیں۔"

"لیکن ہمارا قصور؟"

"جو لوگ دوسروں کو مصنوعی جیل میں رکھ سکتے ہیں — کیا
وہ خود اصل جیل میں نہیں جا سکتے؟"

"کیا!!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"کیوں، اُڑ گئے نا رنگ؟"

انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا — تینوں کو دفتر لایا گیا:



"اب تم بتاؤ — جیلر کون ہے — اور جج صاحب کون بنتا رہا
ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"یہ باتیں ہمیں نہیں معلوم — ہم تو صرف نمبردار تھے جیل کے۔"

"اور انسپکٹر کون ہے؟"

"ہم نہیں جانتے۔"

"اچھا — اس چیز کو پہچانتے ہو؟" یہ کہ کر انھوں نے
جیب سے گلاب کا پھول نکال کر دکھایا۔

تینوں اس پھول کو دیکھ کر زور سے اُچھلے —

# بڑا مجرم

"بہت خوب! تو تم اس پھول کو پہچانتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"یہ آپ کو کہاں سے ملا؟" گومی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جیلر کے کمرے سے۔ میز کے نیچے پڑا تھا۔ اوہو۔ مسٹر گومی۔ آخر تم اس پھول کو دیکھ کر اس قدر پریشان کیوں ہو گئے ہو؟"

"م۔ میں۔ نہیں تو۔" اس نے خود کو فوراً سنبھال لیا۔ ادھر بوگا کا رنگ بھی اُڑا ہوا تھا۔

"تم جیل میں نمبردار تھے یا کچھ اور؟" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی۔ جیل میں۔ میں۔ کیا مطلب؟"

"چلو بھئی۔ انھیں اب کمرۂ امتحان میں ہی لے جانا پڑے



گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

پھر انھیں کمرۂ امتحان میں لایا گیا۔ اکرام بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے ان کے جرائم کی تفصیلات اور ان کے جیل جانے کی تفصیلات پڑھ کر انھیں سنائیں۔ اس کے بعد انسپکٹر جمشید نے کہا:

اب ہم تم پر الزام لگاتے ہیں کہ تم لوگوں نے ایک عدد مصنوعی جیل قائم کر رکھی تھی۔ تم لوگ بے گناہ لوگوں کو پکڑ لیتے تھے۔ ان کے پاس سے ہیروئن برآمد کرتے تھے۔ یعنی خود ہی ہیروئن ان کے سامان میں رکھ کر برآمد کرتے تھے، پھر انھیں حوالات میں بند کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا تھا۔ جج بھی فرضی ہوتا تھا۔ جو انھیں عمر قید سے کم سزا نہیں سناتا تھا۔ عمر قید کی سزا سنا کر ان لوگوں کو اس مصنوعی جیل میں قید کر دیا جاتا تھا۔ اور پھر آزاد کر دینے کی شرط پر ان کی تمام دولت ان سے ٹھگ لی جاتی تھی۔ کیا تم اس جرم سے انکار کرتے ہو؟"

"ہاں جناب! اس قسم کے جرم سے تو ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں۔"

"خیر۔ اگر تمھارا دور کا بھی واسطہ نہیں تو اس مصنوعی

جیل میں عدالت کے کمرے میں اور حوالات والے کمرے
میں تم لوگوں کی انگلیوں کے نشانات کیوں ہیں؟"

"ہماری انگلیوں کے نشانات ۔ جی نہیں ۔ غلط ہے۔"

"ہمارے پاس ان باتوں کے ثبوت موجود ہیں ۔ اور
ان ثبوتوں کی موجودگی میں تم لوگ عدالت میں دم بھی نہیں
مار سکتے ۔ تم تو لوگوں کو نقلی عدالت میں پیش کرتے تھے،
ہم تو تمھیں بالکل اصلی عدالت میں پیش کریں گے۔"

"ضرور پیش کریں ۔ جب ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

"اگر تعلق نہیں ہے ۔ تو اس پھول کو دیکھ کر زور سے
کیوں چونکے تھے؟"

"پھول ۔ نہیں تو ۔ ہم تو آپ کو دیکھ کر چونکے تھے۔"

"اتنا سفید جھوٹ تو نہ بولو بھئی ۔ ہمیں دیکھ کر تم
ضرور چونکے تھے ، لیکن جب پھول کو دیکھا تو پہلے کی
نسبت زیادہ زور سے چونکے تھے ۔ اصل بات یہ ہے کہ
تمھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہمارے پاس تمھاری انگلیوں
کے نشانات کا ریکارڈ ہو گا ۔ اس لیے تم نے مصنوعی جیل
میں احتیاط نہیں کی ، ورنہ تم دستانے بھی استعمال کر سکتے تھے،
اور اس صورت میں ہمارا تم تک پہنچنا بہت مشکل ہو جاتا۔"

"پتا نہیں ، آپ کیا کہ رہے ہیں؟"



"ابھی پتا لگ جائے گا ۔ کس دو بھئی انھیں شکنجے میں۔
یہ اس طرح نہیں مانیں گے۔"

انھیں شکنجے میں کسا جانے لگا ۔ اب وہ لگے تھر تھر
کانپنے ، پھر گومی نے کہا:

"یہ ظلم ہے ۔ ہم عدالت میں جائیں گے اور اس ظلم کے
خلاف آواز بلند کریں گے۔"

"تمھیں عدالت میں پیش ضرور کیا جائے گا ۔ اور تم وہاں
خوب آوازیں بلند کرنا ۔ ہم تمھیں ہرگز نہیں روکیں گے۔"

"گویا آپ یہاں ہم پر ظلم کرنے سے نہیں رکیں گے۔"

"رکوں گا کیوں نہیں ۔ ضرور رکوں گا ۔ لیکن تم لوگ
بھی تو اپنا جرم قبول کر لو۔"

"ہم نے کوئی جرم کیا ہو تو قبول بھی کریں۔"

"یہ یوں نہیں مانیں گے بھئی ۔ ٹیڑھی کھیر ہیں۔"

"ٹیڑھی کھیر کو سیدھا کرنا یہاں کیا مشکل ہے سر!" اکرام
نے ہنس کر کہا اور پھر شکنجوں کے بٹن دبا دیے گئے۔
ان کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں ۔ پھر وہ
چلانے لگے:

"روکو ۔ روکو ۔ بند کرو ۔ ہم بتاتے ہیں ۔ سب کچھ
بتاتے ہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" انسپکٹر جمشید نے کہا اور انھیں سوئچ آف کرنے کا اشارہ کیا۔

سوئچ آف ہوتے ہی ان کی جان میں جان آئی۔

"ہاں! اب بتاؤ۔"

"یہ درست ہے — ہم مصنوعی جیل چلا رہے تھے۔"

"یہ ہوئی نا بات — جج کا کردار کون ادا کرتا تھا؟"

"میں۔" رومی نے کہا۔

"بہت اچھے — اور انسپکٹر کا؟"

"انسپکٹر میں ہوں۔" راجر بولا۔

"جج بھی آ گئے — انسپکٹر بھی — رہ گئے جیلر صاحب — تو وہ تم تھے، ہو گا؟"

"ہاں جناب! یہی بات ہے۔"

"بہت خوب — کیس مکمل ہو گیا — یہ پھول کوٹ کے کالر میں تم لگاتے تھے مسٹر، ہو گا؟"

"ہاں!" اس نے کھوتے کھوتے انداز میں کہا۔

"اکرام! ان کے بیانات لکھ لو — دستخط کرا لو — اور انھیں حوالات کی بجائے براہِ راست جیل بھیج دو — اور دولت انھوں نے جہاں جمع کر رکھی ہے — وہاں چھاپے مارو اور تمام دولت برآمد کرو۔"



"جی بہتر!" اس نے کہا۔

اور وہ باہر نکل آئے۔

"تو یہ کیس اس طرح ختم ہوا — کمال ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیوں! اس میں کمال کیا ہے؟"

"مطلب یہ کہ — کچھ مزا نہیں آیا۔"

"بھئی مزے کا کیا ہے — وہ تو آتا ہی رہتا ہے — اگر اس کیس میں مزا نہیں آیا تو نہ سہی۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" انسپکٹر جمشید نے فرزانہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"پپ — پتا نہیں — مجھے تو معلوم بھی نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر خاموش رہو — ہم گھر جا رہے ہیں — یہ کیس ختم ہو چکا ہے — ہاں!" فاروق نے اسے گھورا — باقی لوگ مسکرا دیے — ایسے میں فرزانہ نے جھلا کر کہا:

"میں کیس دوبارہ شروع تو نہیں کر رہی — کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہو؟"

"نہیں تو — میں تو گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

"ارے — وہ سگریٹ کے ٹکڑے تو رہ ہی گئے۔" انسپکٹر

جمشید نے ہنس کر کہا۔

" اوہ ہاں! سگریٹ کے ٹکڑے۔ جو جیلر کے کمرے سے ملے تھے۔"

" ایک منٹ۔ اکرام ابھی انھیں لے کر روانہ نہیں ہوا ہو گا۔" یہ کہ کر انھوں نے اکرام کو وائرلیس پر مخاطب کیا:

" ہیلو اکرام۔ ہمارے ریکارڈ کے مطابق یہ تینوں سگریٹ پیتے ہیں یا نہیں؟"

" جی۔ سگریٹ۔ نہیں۔ ریکارڈ میں تو یہ بات نہیں ہے۔" اکرام نے بتایا۔

" خیر۔ ان سے ذرا سرسری انداز میں پوچھ لو۔ بلکہ سگریٹ پیش کرنے کے انداز میں یہ کہو کہ اگر تم لوگ سگریٹ پیتے ہو تو منگوا دیے جائیں۔ اگر وہ کہیں کہ ہاں۔ تو پوچھنا، کون سے؟"

" او کے سر۔ میں ابھی ان سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔"

" ٹھیک ہے۔"

تین منٹ بعد اکرام نے ان سے وائرلیس پر بات کی:

" سر۔ ان میں سے تو کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا۔"

" ایک منٹ۔ انھیں ابھی وہیں رکھو۔ ہم آ رہے ہیں۔"



" دھت تیرے کی۔ کیس پھر سے شروع ہو گیا۔" فاروق نے جھلا کر محمود کی ران پر ہاتھ مارا۔

" یہ تمھاری نہیں۔ میری ران ہے۔"

" تو تکیہ کلام بھی تو تمھارا ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

" بہت خوب۔ انصاف اسی کو کہتے ہیں شاید۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

وہ ایک بار پھر دفتر میں داخل ہوئے۔ جلد ہی ان تینوں کو بلوا لیا گیا:

" تو تم سگریٹ نہیں پیتے؟"

" جی نہیں۔ بالکل نہیں۔"

" نمبردار سگریٹ پیتے تھے؟"

" ہاں! تین چار نمبردار ضرور سگریٹ پیتے تھے۔"

" باقی نمبرداروں کو ہم کہاں سے گرفتار کر سکتے ہیں؟"

" ان کے ذاتی پتے تو ہمیں معلوم نہیں ہیں۔"

" تم نے انھیں اس ملازمت پر کس طرح آمادہ کیا تھا؟"

" جب بھی کوئی پرانا قیدی جیل سے باہر آتا تھا۔ ہم اس سے بات کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا بارہ آدمیوں کا گروہ بن گیا۔ ہم چونکہ جیل کے دروازے پر ہی ملاقات کر لیتے تھے۔ اس لیے آج تک گھر کے پتوں کی

ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

"اب ہم ان نمبرداروں کو کس طرح گرفتار کریں ۔ اور اکرام ۔ دولت کے بارے میں انھوں نے کیا بتایا ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ان کا کہنا ہے ۔ دولت تو وہ ساتھ ساتھ اڑاتے رہتے ہیں ۔ اس میں سے تو کچھ بھی باقی نہیں ہے۔"

"یہ ان لوگوں کا بہت بڑا جھوٹ ہے ۔ ہمیں ان کے ٹھکانوں پر چھاپے مارنا پڑیں گے ۔ تب کہیں جا کر دولت برآمد ہو گی۔"

"تو میں ابھی چھاپے مارنا شروع کر دیتا ہوں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

ٹونی، شیدا، گومی، راجر اور بوگا کے گھروں اور دوسرے ٹھکانوں کو کھنگال ڈالا گیا ۔ لیکن ان کے گھروں سے بہت کم دولت مل سکی ۔ کسی بنک کی چیک بک بھی نہ مل سکی کہ بنک سے ہی پتا کر سکتے ۔

"ان لوگوں کو اگر ایک بار پھر شکنجے میں کسا جائے تو شاید یہ باقی لوگوں کے نام اور پتے بتا دیں گے۔" اکرام نے تجویز پیش کی۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"



اس ترکیب پر بھی عمل کیا گیا ، لیکن وہ کسی اور کا نام پتا نہ بتا سکے ۔ انسپکٹر جمشید نے ان سے ایک اور سوال کیا:

"اچھا یہ بتاؤ ۔ تم لوگوں میں سے جیلر کون ہے؟"

"جیلر ہم سے کوئی نہیں ہے ۔ جیلر کوئی اور ہے ۔ ہم اس کا نام پتا بھی نہیں جانتے۔"

"اور کیا وہی تم لوگوں کا انچارج ہے؟"

"ہاں! ساری دولت اس کے پاس جمع کرائی جاتی ہے، پھر وہ ہمیں حصہ دیتا ہے اور تنخواہ بھی۔"

"اچھا! جیلر سگریٹ پیتا ہے؟"

"ہاں! سگریٹ وہ پیتا ہے۔"

"شکریہ! ہم دیکھ لیں گے۔" انھوں نے دیکھا۔

اب انھوں نے اکرام سے کہا:

"ان لوگوں کو میں اپنی نگرانی میں جیل پہنچانا چاہتا ہوں، تم بھی ساتھ چلو۔"

"او کے سر۔"

وہ اسی وقت جیل پہنچے ۔ ان پانچوں کو ساتھ لیے وہ جیلر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے ۔ کاظم بیگ کسی فائل میں گم تھے ۔ آہٹ سن کر چونک اٹھے اور پھر ان کے چہرے پر حیرت پھیل گئی ۔

"آئیے آئیے — یہ آپ کن لوگوں کو ساتھ لائے ہیں؟"

"یہ اب آپ کی جیل میں قیدی کی حیثیت سے رہیں گے۔"

"کیا انھیں سزا سنا دی گئی ہے؟"

"نہیں — مقدمہ تو ان پر اب چلے گا۔"

"اوہ اچھا — لیکن ان کا کیا جرم ہے؟"

انھوں نے ان کے جرائم کی تفصیل سنا دی — وہ خاموشی سے سنتے رہے، پھر بولے:

"یہ کہانی سن کی حیرت ہوئی۔"

"ابھی آپ کو اور حیرت ہو گی۔"

"وہ کیسے — کیا اس کہانی کا ابھی کچھ حصہ رہتا ہے؟"

"ہاں بالکل! ابھی سب سے بڑا مجرم گرفت میں نہیں آ سکا۔"

"آپ کا مطلب ہے — وہ جج؟"

"جی نہیں — وہ جیلر — آپ بھی اتفاق سے جیلر ہیں — اور آپ سگریٹ بھی پی رہے ہیں۔"

"میں سگریٹ بھی پی رہا ہوں — کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر آپ اس جیلر والی سگریٹ پی رہے ہوں تو ہم آپ پر بھی شک کر سکتے ہیں۔"

"آپ شاید مذاق کے موڈ میں ہیں۔"



"جی نہیں — آپ اپنا سگریٹ مجھے دکھائیے ذرا۔"

"مسٹر انسپکٹر جمشید — آپ ہوش میں تو ہیں؟"

"جی ہاں! بالکل — بالکل ہوش میں ہوں — آپ یہ سگریٹ دکھائیں ذرا۔"

یہ کہہ کر انھوں نے سگریٹ ان کے ہاتھ سے اُچک لیا۔

"یہ — یہ کیا؟"

لیکن انھوں نے کوئی جواب نہ دیا — وہ تو اس سگریٹ کو اس سگریٹ کے ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑے سے ملا رہے تھے — جو جیلر کے کمرے سے ملے تھے —

"واہ! مزا آگیا — یہ دونوں بالکل ایک جیسے ہیں۔"

"تو کیا ہوا — نہ جانے کتنے آدمی ایسے سگریٹ پیتے ہیں — کیا اس طرح آپ مجھے مجرم ثابت کر سکتے ہیں؟"

"جی نہیں — صرف اتنی سی بات سے تو ہم آپ کو مجرم ثابت نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"مشکل یہ ہے کہ — جیلر کی انگلیوں کے نشانات بھی تو ہمیں وہاں سے ملے ہیں — اب اگر آپ کی انگلیوں کے نشانات بھی ان نشانات سے مل جاتے ہیں تو اس صورت میں اس سگریٹ کے ٹکڑے کا مل جانا بہت اہم ہو جاتا ہے۔"

" نن ـ نہیں ـ میری اُنگلیوں کے نشانات وہاں ہرگز نہیں ہو سکتے۔" جیلر صاحب نے پُر زور آواز میں کہا۔

" لیکن کیوں؟"

" اس لیے کہ میں ہمیشہ وہاں دستانے ..."

وہ ایک جھٹکے سے رُک گیا۔

" شکریہ جیلر صاحب ـ ہمیں آپ کے انھی الفاظ کی ضرورت تھی ـ یہ بات ہم جانتے تھے کہ سگریٹ کے ٹکڑے والا ثبوت مکمل ثبوت نہیں مانا جائے گا ـ اور آپ کو ہم وہاں دستانوں میں دیکھ چکے تھے ـ لہٰذا آپ پر جرم کس طرح ثابت کرتے ـ سو میں نے یہ چال چلی اور دیکھ لیں، آپ میری چال میں فوراً آ گئے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

" لیکن آپ میرے ان الفاظ کو عدالت میں کس طرح ثابت کریں گے ـ میں کہہ دوں گا کہ میں نے یہ الفاظ نہیں کہے۔"

" شکریہ! ہمیں آپ کے جن الفاظ کی ضرورت تھی ـ وہ آپ نے اب ادا کر دیے ـ اب ہمارا کام اور آسان ہو گیا۔"

انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" کیا مطلب؟" وہ زور سے اُچھلا۔



" یہ کہ ـ آپ کے تمام الفاظ نوٹ ہو چکے ہیں ـ مطلب یہ کہ ریکارڈ ہو گئے ہیں۔"

" نن ـ نہیں۔"

" بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی ـ آپ لاکھ چالاک سہی، لیکن جرم تو جرم ہے ـ ایک دن ظاہر ہو کر رہتا ہے ـ جیلر صاحب ـ اکرام! ان کے ہتھکڑیاں لگا دو ـ یہ بھی کیا یاد کریں گے، کسی رئیس سے پالا پڑا تھا۔"

مجرم گنگ رہ گیا ـ شاید اس کے ہاتھوں پیروں کی جان نکل گئی تھی ـ پھر اس کے بنک سے اور گھر سے تمام دولت برآمد کر لی گئی ـ اور لوٹے جانے والوں کو بڑی حد تک لوٹائی گئی ـ ان میں رجب میر بھی تھا ـ اس کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا ـ اور یہ رجب میر ہی تو تھا ـ جس کے ذریعے یہ کیس شروع ہوا تھا ـ ورنہ یہ اندھیر نہ جانے کب تک جاری رہتا۔

سب کو رقوم ملنے کے بعد کہیں جا کر انھوں نے اطمینان کا سانس لیا ـ گھر پہنچے تو فاروق نے محمود سے کہا:

" پہلے تم اپنے جوتے کی خبر لو ـ آخر وہ حضرت کہاں رہ گئے تھے۔"

" بتایا تو تھا ـ جوتا بدلا تو وہ اس جوتے کی ایڑی

میں رہ گیا، جو اُتارا تھا۔"
"مہربانی فرما کر یا تو تم ہر جُوتے کی ایڑی میں ایک چاقو رکھو۔ یا پھر جُوتا بدلا ہی نہ کرو۔" فرزانہ نے ترکیب بتائی۔
"تمھارا مطلب ہے۔ میں ساری زندگی ایک جُوتے میں گزار دوں۔"
"جُوتے میں زندگی گزارنے کو کون کہہ رہا ہے۔" فرزانہ نے جھنا کر کہا۔
"بلکہ تم زندگی میں جُوتا گزار دو۔" فاروق فوراً بولا۔
اور وہ مسکرانے لگے ــــ

